سات سمندر پار

اختر ریاض الدین احمد

مکتبۂ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد - لاہور

طابع ______ الطاف حسن قُریشی
مطبع ______ اُردُو ڈائجسٹ پرنٹرز، بیرون لوہاری گیٹ، لاہور
ناشر ______ مکتبۂ اُردُو ڈائجسٹ، سمن آباد۔ لاہور
باردوم ______ ستمبر ۱۹۶۹ء
تعداد اشاعت ______ تین ہزار
قیمت ______ چار رُوپے

انتساب

تحریکِ امدادِ باہمی کے نام !

جس کے "تعاون" کے بغیر یہ سفرنامہ کبھی تکمیل نہ پاتا،

نہ میاں کو دَورے رہتے، اور نہ مجھے دَورے پڑتے۔

ترتیب

تعارف

فکر و فن کی دُنیا میں کبھی کبھی جو ہلکے ہلکے زلزلے آتے ہیں، وہ بعض دفعہ بطنِ گیتی سے اَنجانے عجائب و نوادر برآمد کر کے اپنی یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ زیرِ نظر تالیفِ لطیف ایک ایسے ہی زلزلے کی یادگار ہے، کہ اس کی کارفرمائی سے پہلے اس اَمر کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے کہ ایک بالکل نئی فنکار کے افکارِ تازہ و احساساتِ لطیفہ ہمارے اَدب میں داخل ہوتے ہی اس کی فضا پر چھا جائیں گے اور ایک ایسا ارتعاشِ جمیل و لطیف پیدا کر دیں گے جو ایک عرصۂ دراز تک ہمارے تصوّرات کو لرزاتا اور ہمارے دِلوں کے تار ہلاتا رہے گا۔

بیگم اختر ریاض کے بیان میں ایک ماہرانہ گرفت اور ایک فنکارانہ آراستگی اپنے عروج میں نظر آتی ہے اور وہ ہلکا ہلکا مزاح جو اُن کی نگارشِ گوہریں میں ایک سلکِ ریشمیں کی طرح بل کھاتا چلا جاتا ہے، اس کی سب سے دلکش خصوصیّت کا امتیاز رکھتا ہے، پھر وہ جس بے ساختگی اور بے تکلفی سے آپ کو جاپان کے خیابانوں اور گیشا خانوں اور صنعت و تجارت کے ہنگامہ زاروں اور تعلیم و تربیت کے دبستانوں کی سیر کراتی ہیں، اُسی خوبی اور ملائمت سے آپ کا ہاتھ تھام کر رُوس کے برفستانوں اور عجائب خانوں اور مقبروں اور زیارت گاہوں میں لیے پھرتی ہیں اور اس طلسم کدۂ حیرت سے آپ تبھی برآمد ہوتے ہیں، جب یکایک ان کا سحر آگیں بیان ختم ہو جاتا ہے اور آپ چونک اُٹھتے ہیں اور بے اختیارانہ سوچنے لگتے ہیں: اے کاش! اے کاش!

صلاح الدّین احمد

ایڈیٹر: "ادبی دُنیا" لاہور

پیش لفظ

پہلے زمانے کے سفرنامے جغرافیائی حدود سے شروع ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ تاریخ کے دھارے میں جذب ہوتے جاتے تھے۔ ماضی کا مسافر مستقبل کا مؤرخ بن بیٹھتا تھا، لیکن زمانۂ حال کا دَور کچھ اور ہی طرز کا ہے۔ سائنس کی تیز رفتاری نے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کی طنابیں اس طرح کھینچ رکھی ہیں کہ وقت اور فاصلے کا وجود مُسلسل سمٹتا جا رہا ہے، اب فاصلے ارضی کم اور نظریاتی زیادہ ہیں؛ چنانچہ اب مُسافر بھی آنکھ سے کم اور عینک سے زیادہ دیکھتا ہے۔ اس عینک کے شیشے نیویارک میں بنے ہوں یا موسکو میں، ان میں ہر ایک کے حسب حال کچھ دنیا سُرخ، کچھ دنیا سفید اور باقی ساری کی ساری دُنیا سیاہ نظر آتی ہے، موسکو کی آنکھ سے دیکھیے یا نیویارک کی آنکھ سے، لندن کی آنکھ سے دیکھیے یا پیرس کی آنکھ سے، ان سب کی نظر میں افریقہ کالا اور ایشیا پیلا ہے۔ سُرخی اور سفیدی کے امتزاج میں حُسن، نکھار، صحّت اور خوشبُو ہے۔ کالے پیلے کی ملاوٹ میں جدّ و جہد کا غبار، محنت کی تھکن، مشقّت کے پسینے کی بُو ہے۔ رنگ و بُو کی یہ نظریاتی بھول بھلّیاں ایک عام مسافر کو شدید ذہنی انتشار میں سرگرداں رکھ سکتی ہے، لیکن بیگم اختر ریاض ایسی کسی سرگردانی کا شکار نہیں ہوئیں۔ آہنی پردے کے اِس طرف یا اُس طرف اُنھوں نے کسی سے کوئی عینک مستعار نہیں لی، اُنھوں نے جو کچھ دیکھا اپنی آنکھ سے دیکھا اور جو کچھ لکھا اپنے قلم سے لکھا ہے۔ میری نظر میں یہ ایک قابلِ رشک کامیابی ہے۔

سات سمندر پار میں خالی مزاح، رنگینی اور روانی ہی نہیں، اس میں ایسی فکر نہیں جس سے کتاب کی بو آئے یا جو بوجھل ہو، مصنفہ کی فکر محسوسات میں ڈوبی ہوئی ہے، لیکن جزیات میں جا کر منتشر نہیں ہو جاتی، بلکہ ہر وقت کُل کی طرف رجوع کرتی ہے، تخلیقی اور جبلّی قوّت، احساس اور ادراک کا جو بہترین سنگم اُن کی تحریر میں ملتا ہے بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کردار نگاری میں بیگم اختر ریاض کو ملکہ حاصل ہے، تشبیہات میں انفرادیت، اشاروں میں مزاح کی جھلکیاں اور طنز میں ایک اچھوتا پن ہے، ہر کردار کی بُنیادی خصوصیت کو وہ برش کی ایک بے جھجک جُنبش سے اُجاگر کر دیتی ہیں، وہ ہنس ہنس کے ہمسفروں پہ فقرے کستی ہیں اس انداز سے کہ ان سے تعصب پیدا نہیں ہوتا، الٹی دلچسپی بڑھتی ہے۔ پیار آتا ہے:

"ایک شرارہ تھیں تو صرف اُنیس سال کی، لیکن ان کی شخصیت میں بیسویں صدی اپنے پُورے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا حُلیہ بیان کرنا مُشکل ہے۔ پکاسو اپنے تجریدی آرٹ کے دو نصف دائروں میں د) یوں پیش کر سکتا ہے ......"

انہیں مناظرِ قدرت اور ناظرِ قُدرت سے عشق معلوم ہوتا ہے، سمندر سے ان کا لگاؤ جنون کی حد تک ہے۔

"معلوم ہوتا تھا ہزارہا بلوریں جھاڑ فانوس چٹخ چٹخ کر پانی میں کرچی کرچی ہو رہے ہیں، ان پانیوں میں کتنے نقش بنتے اور بگڑتے، گویا کوئی بے چین مصوّر دائرکلر میں لطیف عظمتیں بے اعتنائی سے کھینچے اور مٹا دے ...."

چاند سے وہ کھیلتی ہیں، چھیڑتی ہیں ترس کھاتی ہیں۔

"رات کی خنک خلا میں چاند اکیلا تنہا لٹک رہا تھا۔ گویا ساری مخلوقات

کے گناہ کی پاداش میں صلیب پہ چڑھا دیا گیا ہو.....“

سات سمندر پار میں جدّت ہے، جہاں بلینہ نظر ہے، شوخی ہے اور مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ اس کی رنگینی اور لطافت کے پس منظر پر مغربی فکر میں مشرق کا دل دھڑکتا ہے۔

بیگم اختر ریاض نے جس آن بان سے اُدب کی وادی میں قدم رکھا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ وہ بہت سے اور گُل کھلائیں گی، یہ بڑی نیک فال ہے۔ کیونکہ ع

”گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے“

قُدرت اللہ شہاب

ٹوکیو

جاپان کو مشرقِ بعید میں شمار کیا جاتا ہے لیکن جب دَورِ حاضر کا تازہ شاہکار ہوائی جیٹ گیارہ گھنٹے میں سیدھا کراچی سے ٹوکیو پہنچا دیتا ہے، تو وہاں کا منظر دیکھ کر انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جاپان نہ اتنا مشرق ہے اور نہ اتنا بعید۔

رات ہو چکی تھی جب ہمارا جہاز ٹوکیو پہنچا، کسٹم والوں نے حسبِ معمول سوال کیے اور سامان کی جانچ پڑتال میں بہت دیر لگا دی، تھکے ہارے اپنے ہوٹل میں آ کر سو گئے، صبح لمبی تان کر اُٹھے، تو سُورج دیوتا کمرے کے اندر اور میرا دیوتا کمرے کے باہر، وہ کانفرنس میں پاکستان کا تجزیہ کر رہے ہوں گے اور مَیں نے چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہوٹل نہایت صاف سُتھرا، کمرے میں ہر جدید آسائش، غسل خانہ اتنا شفّاف کہ قدم رکھنے کے بجائے اُس کے قدم لینے کو دل چاہے۔ ربڑ کے چپل اوندھے بستروں کے نیچے رکھے ہُوئے، جن پر پرچی لگی ہوئی DISINFECTED (جراثیم سے پاک)، پانی کے گلاسوں پر بھی یہی پرچیاں چسپاں، مغربیت تو بستر سے ہی شروع ہو گئی تھی، یعنی دو کمبل پلنگ کے آہنی شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے کہ آپ کسی طرح ان میں گھس نہیں سکتے، سوائے اس کے کہ سرہانے کی طرف سے آہستہ آہستہ اپنے جسم کو چھوٹی چھوٹی قسطوں میں اندر پہنچایا جائے اور جب پہنچ جائے، تو بھی گردن اور چہرہ دونوں باہر ٹھنڈے تکیہ پر بے گھر مہاجروں کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔

صبح دم کھڑکیوں سے باہر نگاہ ڈالی تو "چیری" کے گلابی شگوفے قطار در قطار کھڑے لہرا رہے تھے۔ "جاپان دیکھیے تو اپریل میں" سن سن کر عمر گزر گئی تھی، اور اب جاپان، بہار اور میں ایک ہی وقت میں دوچار ہوئے تھے۔ اپریل کا مہینہ بہاروں کا پیامبر ہوتا ہے، اس ماہ کے شب و روز پھولوں کی خوشبو میں رچے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی شوقِ بہاراں مجھے جاپان لایا تھا۔ چیری کے شگوفوں کی لہک میں میں سیدھی باہر آ گئی، لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے جو چھو کر دیکھا تو دھچکا سا لگا، شگوفے مصنوعی کاغذ کے تھے جو اتنا باریک تھا کہ چھو کر بھی فرق کا مشکل سے پتہ چلتا تھا۔ جاپانی دُنیا کے بہترین نقال مانے گئے ہیں اور مغربی صنعتوں کی نقالی کر کر کے یورپ کی اقتصادیات کے لیے ایک خطرہ بن گئے ہیں، لیکن قدرتِ یزداں کی نقالی ہمیں کچھ بھائی نہیں، یہ سراسر سیاحوں کے ساتھ دھوکا یا قدرت کا مضحکہ تھا۔ سنا ہے کہ پچاس سال پہلے ٹوکیو ایک وسیع باغ کی طرح شگوفوں سے معمور تھا، لیکن صنعتی ترقّی کی بھیانک بدصورتیوں نے چیری کے درختوں کو پیچھے ہٹا ہٹا کر دھوئیں اور کالک سے بھرے ہوئے کارخانے کھڑے کر دیے۔ اب ٹوکیو کے مشہور شگوفے صرف دو ایک مشہور پارکوں میں پائے جاتے ہیں اور غالباً اسی لیے پھولوں کی اس رسیا قوم نے چیری کے اصلی پھولوں کی کمی کو نقلی پھولوں سے پورا کر دیا، جاپان کے قدرتی حسن کو امریکی نامہ نگاروں نے ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، اگر اتنی مبالغہ آمیز تعریف نہ سنی ہوتی، تو مجھے شاید کچھ زیادہ خوبصورت لگتا۔ جاپان میں قدرت کی صنعت کاریاں سب مختصر پیمانے پر ہیں، جن آنکھوں نے ہمالیہ کی دیوزاد برفیلی چوٹیاں اور ان کے دامن میں پھیلی ہوئی گلگوں وادیاں، پھر سندھ کے چمکتے ہوئے وسیع ریگ زار اور سفید اژدہوں کی طرح بل کھاتے ہوئے بے پناہ دریا دیکھے ہوں تعجب نہیں کہ انہیں جاپان کا سب سے بڑا آتش فشاں پہاڑ فیوجی یاما ایک پیارا سا سفید ریش بونا معلوم ہوتا ہے جس کا سر ہمالیہ کے آدھے جسم تک بھی نہیں پہنچتا۔ جاپانی اس

کے عاشق اور پرستار ہیں۔ میں جب واپس آنے لگی، تو بہت سے ملنے والوں نے مجھ سے کہا کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ فیوجی یاما کی زیارت ضرور کرتی جائیے، اسے دیکھے بغیر آپ کو نروان نہیں مل سکتا۔ ننھی ننھی جھیلیں، مُنّے مُنّے دریا، چھوٹی چھوٹی آبشاریں، لکڑی کے کھلونوں کی طرح تراشے اور سجائے ہوئے باغ، جو گڑیوں کے چمن معلوم ہوتے ہیں، ان بالشتیے باغوں میں انسان افسانوی سیّاح گلیوَر کی طرح محسوس کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور وہ سنبھل سنبھل کر چلتا ہے کہ کوئی بالشتیا پیروں میں نہ آ جائے چھوٹی چھوٹی مصنوعی جھیلیں، پتھریلی پگڈنڈیاں، سنگین لالٹینیں اور کہیں کہیں لکڑی کے منقش دالان، جن میں اکثر ناچ رنگ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ کچھ عمدہ باغوں میں عجائب گھر جن میں فنونِ لطیفہ کے نمونے نمائش کے لیے رکھّے گئے ہیں۔ اِن باغوں میں نہایت حسین سدا بہار انواع و اقسام کے سبز پودے اور بیلیں، اپریل کے مہینے میں میگنولیا اور کمیلیا کے کٹورے خُوب کھلے ہوئے تھے۔ آتشی گلابی آزیلیا کے گچھے کے گچھے لہروں کی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر ایسے بدمست ہو کر پھیلے ہوئے تھے کہ ایک سفید پتّی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نازک بے جان لکڑی سے یہ کرشمۂ تخلیق! پھول ہالینڈ کا پیشہ بلکہ تجارت لیکن جاپانیوں کے لیے ایک طریقِ زندگی ہے۔ ایک بُرا بُسا قصّاب بھی اپنی دُکان پر دو چار پھول اٹکائے بیٹھا ہے۔ پھولوں کی سجاوٹ محض ایک فن ہی نہیں، بلکہ ایک فلسفہ ہے۔ گُل آرائی اور گلدانوں پر دیوان کے دیوان لکھّے ہوئے ہیں۔ شاید ایک جاپانی گلدان چننے میں زیادہ وقت لگتا ہے اور دُلہن چننے میں کم۔ سجاوٹ کا ہر نیا طریقہ ایک فلسفۂ حیات کا غمّاز اور عکّاس ہے۔ حیاتِ فانی اور بقائے ابدی اَز ٹہنیوں کے زاویوں، پھولوں کے رنگوں اور ڈنڈیوں کی اُونچائی نیچائی سے بتائے ـے ہیں، ترتیبِ گُل قلبِ انسانی کی اندرونی کیفیتیں عیاں کرتی ہے۔ پھولوں کے سالانہ جشن ـرتے ہیں۔ مختلف پھولوں کے مختلف موسموں میں تہوار منائے جاتے ہیں جن میں نوعمر جاپانی لڑکیاں

ناچتی گاتی ہیں، پھولوں کے جلوس نکلتے ہیں۔

ٹوکیو کی آبادی نے ایک کروڑ پر پہنچ کر اس دارالحکومت کو دُنیا کا سب سے (زیادہ گنجان) بڑا شہر بنا دیا ہے، شب کی رَوشنیاں، فلک پیما عمارتیں، انسانی قطاریں، چلاتی کاریں، بظاہر یہ یورپ کا کوئی بڑا شہر بھی ہو سکتا ہے، شاید بیسویں صدی نے اپنی پہلی کروٹ یہیں بدلی ہوگی، یا کم از کم مغرب کے دیوتا نے اپنا دُوسرا جنم چھپٹی شکلوں اور چمپئی رنگتوں میں لیا ہے، یہ شہر یہ ملک ایشیا سے باہر مشرقیت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ لباس بھی جو عام نظر آتا ہے مغربی ہے۔ بھلا ہو لباسوں کے کارخانوں کا جو لاکھوں مرد عورتوں کو ایک ہی نمُونے کی پتلون اور سکرٹ پہنا کر بظاہر جمہوری یکسانی پر لے آئے ہیں، اگر چہروں اور صُورتوں پر نظر نہ پڑے، تو ہر طرف ایک بھرپور مغربی سوسائٹی کے نقوش نظر آتے ہیں۔

اِکّا دکّا عورتیں اپنے قومی لباس یعنی کمونوں میں بھی دکھائی دیتی ہیں، وہ یا تو بہت پُرانے گھروں کی ہوتی ہیں، یا پھر گیشائیں ہیں یا سیّاحوں کی دلچسپی کے لیے چند ایک عجوبے برقرار رکھے گئے ہیں جس طرح امریکہ میں سُرخ ہندیوں کو بچا بچا کر ایک دو جنگلی بستیوں میں اس لیے پالا پوسا جا رہا ہے کہ سیّاح نا اُمید واپس نہ جائیں۔ یُوں تو ہمارے شہر سے بھی فرنگی سیّاح دل شکستہ جاتے ہیں، کیونکہ انہیں مال روڈ پر نہ اُونٹ دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہاتھی۔

جاپانی مرد کا چہرہ جاپانی عورت کے مقابلہ میں سُتا ہوا ہے، مثلاً اگر عورت کا چہرہ ۵ سیر کا گلابی گوشت ہے، تو مردانہ ٹکڑا پونے چار سیر کا، عورت وہاں کی بے تحاشا پلی ہوئی ہے۔ اب فیشن میں نوعمر لڑکیوں نے کمر پتلی کرنی شروع کر دی ہے لیکن پھر بھی اوسط چہرہ بھاری طباق اور ٹانگیں سندھی پلنگ کے پائے، کیمونو تو عیب پوشی کر سکتا تھا، یہ مُوئی سکرٹ تو خود اپنی ٹانگ کھولے اور لاجوں بھی نہ مرے۔ قوم کی صحت عمُوماً بہت دَمکتی چمکتی ہوئی نظر آئی، مرد تو زرد

نظر آ بھی جاتے ہیں، عورتیں خاصی گوری، خاص طور پر جوان لڑکیوں کے گال سُرخ سیب کی مانند دہکتے ہوئے، اکثریت کو تو ہلکی گلابی لپ اسٹک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے سرد موسم اپریل میں ہمارے دسمبر کی سردی تھی اور کچّی مچھلی کی خوراک ان کی جوانی، صحت اور حسن کا راز بتایا جاتا ہے۔ مشرقِ بعید میں ویسے بھی عورت کا پچاس سال تک جوان رہنا بعید از امکان نہیں۔ اس خطّے کے پانی میں نرمی، ہواؤں میں لوچ، عورت کی رنگت میں صباحت اور جلد میں ملائی کی سی چکنائی ہے، ایک ستّر سالہ چینی شہزادی نے ایک پارٹی میں بتایا کہ چین کے رنگین شہنشاہی عہد میں وہ تازہ شیرِ مادر میں سچّے موتی پیس کر کھاتی اور لگاتی تھی، اس وقت تک اس کے چہرہ پر ایک شکن بھی نہیں تھی، کس حسرت سے میں نے شہزادی کو دیکھا اور سوچا کہ پہلی چیز کا انتظام تو ہو جائے گا کہ ہمارے محلّہ میں کوئی نہ کوئی تیار بیٹھی ہوگی، موتیوں والی بات البتّہ مشکل ہے۔

اپنے قومی لباس میں جاپانی عورت سر تا پا، ایک چینی کی گڑیا ہے جس کی آنکھوں کی جگہ دو ننھّی ننھّی کانچ کی گولیاں سی گوشت میں آدھی دبکی ہوئی چمک رہی ہیں۔ جب وہ پوری آنکھ کھولتی تھیں، تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ابھی آدھی اور کھلنی باقی ہیں، ان خواتین کو غیر ملکیوں کی آنکھیں دیکھ کر اپنی آنکھیں چِروانے کا شوق چرایا ہے۔ سرجن ڈاکٹروں کی عید ہے۔ وہ ہزار ہا عورتوں کی آنکھیں استعارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً کھول رہے ہیں۔ ذرا نشتر لگا اور چشمِ نیم وا نرگس ہو گئی اس قسم کے نہمل خبط صرف عورتوں تک محدود نہیں، مَردوں کو دانتوں پر سونا چڑھوانے کا شوق ہے ہر تیسرا چوتھا جاپانی اپنی سنہری ملمع والی مسکراہٹیں لیے اِتراتا پھرتا ہے، میرے خیال میں اُن کے اس خبط میں عورتوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے، عورت سونے پر فریفتہ ہے اور اگر کہیں اور سونا دکھائی نہ دے، تو کم از کم عاشق کے دانت ہی پر نظر آ جائے۔ دُوسرے اِس مُلک میں مَردوں تک کے جسم پر بال نہیں۔ جب جاپانی مرد امریکن فلم کے ہیرو کے سینے پہ سیاہ جنگل دیکھتے ہیں، تو ان

کے سینے پہ سانپ لوٹ جاتا ہے اور وہ سیدھے بیوٹی سیلون کا رُخ کرتے ہیں اور وہاں اپنے سینے پہ کاشت کاری شروع کروا دیتے ہیں۔ (دروغ برگردنِ راوی)

جاپانی عورت چاہے کتنی ہی میم بنتی جا رہی ہو، جس وقت وہ مُنہ کھولتی ہے تو اس کی آواز کے ساتھ مشرقیت شروع ہو جاتی ہے، ہمارے شاعروں کی تخیلی شیریں دہنیں بس وہیں لباسِ مجاز میں آئی ہیں، وہ بولتی کیا ہیں کہ مُنہ سے رس ٹپکتا ہے اور ہمارے مردوں کے مُنہ سے پانی، یہ ان کی نسوانیت پر جی جان سے فدا ہیں، میں جب ان شیریں دہن عورتوں کے سامنے آواز نکالتی تھی، تو معلوم ہوتا تھا کمرے کے شیشے چٹخ گئے۔

جاپان خاص الخاص مردوں کا ملک ہے۔ اس میں خُدا نہ کرے کہ کہیں کبھی عورت پیدا ہوتی۔ زندگی کے سارے عیش مرد ذات کے لیے مخصوص ہیں۔ اسلام نے مَرد کو مجازی خدا ہی کہہ کے چھوڑ دیا، جاپان میں تو اس خدائے مجازی کی پرستش ہوتی ہے۔ وہ وہاں حقیقی معنوں میں دیوتا ہے اور اپنے سنگھاسن پر ابھی تک براجمان ہے، بچپن سے لڑکی کو مرد کی خاطر تواضع کرنی سکھائی جاتی ہے، جاپانی سارا دن دفتروں میں رہتے ہیں، بیویاں گھروں میں کام کرتی ہیں یا پھر ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہیں، لیکن شام کو دونوں میاں بیوی اکٹھے کم ہی بیٹھتے ہیں۔ عورتیں شام کو اپنے شوہروں کے ساتھ کم ہی نکلتی ہیں۔ میں جن جن پارٹیوں میں گئی، بہت گھبرائی کہ ان میں اکثر میرے سوا صرف ایک دو اور خواتین ہوتی تھیں اور وہ بھی بیرونی۔ جاپانی مرد اپنی بیوی سے صرف غربت اور بے رونقی منسوب کرتا ہے اور تفریح کے لیے وہ کپڑے بدل کر سیدھا گیشا گھر پہنچتا ہے اور وہیں دن بھر کی تھکن اُتارتا ہے اور بیوی کا ظرف دیکھیے کہ وہ خاوند کو گیشا گھر جانے کے لیے کپڑے پہناتی ہے اور اگلے روز گیشا گھر کے بل ادا کرتی ہے میرے خیال میں عورتیں جاپان کی سب سے بڑی صنعت ہیں اور اپنے ملک کے لیے

زرمبادلہ بھی خوب کماتی ہیں، لیکن مردوں کی زندگی کا ایک اہم جزو نہیں ہیں۔ حالانکہ امریکی دور میں عورتوں کو تعلیم عام ملی، ملازمتیں ملیں، ووٹ ملے، لیکن پھر بھی مرد باہر اور اندر دونوں جگہ مالکِ کُل ہے۔ اس کی کوتاہیاں طلاق کی وجہ نہیں بن سکتیں۔ ایک دلچسپ چیز جو دیکھی وہ گھر داماد کی رسم ہے۔ بڑے بڑے معزز اور امیر گھرانے جن کے یہاں کوئی لڑکا وارث نہ ہو، گھر داماد بنا لیتے ہیں اور یہ گھر داماد اپنے سسر کا نام اختیار کر لیتا ہے مثلاً کشی موٹو کی بیٹی مس کسی موٹو شادی کے بعد مسز کشی موٹو کہلائے گی۔ اس طرح خاندان کا نام چلتا رہتا ہے۔

یہ گیشا کیا بلا ہے؟ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا اور دو تین کتابیں پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ گیشا ایک نہایت اعلیٰ شائستہ، مہذب اور ہنرمند طوائف ہے اور یہ نوابی پیشہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود جاپانی معاشرہ۔ گیشاؤں کی تربیت میں کئی کئی سال لگتے ہیں اور انہیں گانا بجانا، ناچنا، بامذاق گفتگو، حاضر جوابی، لطیفے، پہیلیاں، کھیل، چہلیں اور کئی قسم کے فنونِ لطیفہ سکھائے جاتے ہیں، تاکہ شام کو مردوں کی تفریح مہیا کر سکیں، گیشا کو مرد کی رگ رگ سے واقف کیا جاتا ہے کہ کس طرح اُسے بہلاتے ہیں، اس کے دماغی اور جسمانی بوجھ ہٹاتے ہیں، کس طرح ناز نخرے اور پیار سے شراب پلاتے ہیں۔ عموماً کاروباری دعوتیں گیشا خانوں میں دی جاتی ہیں اور لاکھوں، کروڑوں کے کاروباری معاملوں کے فیصلے بھی ان ہی رنگین محفلوں میں کیے جاتے ہیں، لیکن ایسی تفریحات کے علاوہ ٹکٹ میں اور کچھ شامل نہیں ہے۔ رات گزارنے کے لیے بہت بھاری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس لیے عموماً مرد ناچ گانے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ عام سستی طوائفیں بھی ہیں اور ان سب کے لیے اکثر الگ علاقے مخصوص ہیں، گیشا کی طرح ان طوائفوں کا بھی ایک اپنا پرائیویٹ محکمہ یا یونین ہوتا ہے۔ ہر گاہک سے ایک معاہدہ کیا جاتا ہے اور کوئی مرد کسی طوائف کو مصیبت میں ڈال کر بھاگ نہیں

سکتا، اگر طوائف کے یہاں بچّہ پیدا ہو جائے، تو اس مرد کو اس کا خرچ دینا ہوتا، یا بچّہ سنبھالنا پڑتا ہے۔ گیشا کے پاس رات گزارنے کے لیے باقاعدہ ایک عہد نامہ بھرنا پڑتا ہے اور اگر گیشا کے یہاں بچّہ پیدا ہو جائے، تو اس کی پرورش وہی مرد کرے گا، یا اس بچّہ اور خود گیشا کو گھر لے آئے گا اور یہ ناجائز بچّہ گھر کی بیوی کو ماں کہے گا اور سمجھے گا اور گیشا ایک گورنس کی حیثیت سے گھر میں رہے گی۔ بظاہر یہ قاعدہ انسانیّت پر مبنی ہے، جس نے کم از کم پیشہ ور عورتوں کے حقوق تو محفوظ کر دیے۔ پھر گیشاؤں کی بھی ذاتیں ہوتی ہیں، اچھی گیشا اوبی (OBI) پیچھے باندھتی ہے اور بُری گیشا سامنے۔

مجھے جاپانی گھر دیکھنے کا بہت شوق تھا، کئی لوگوں سے کہا کہ اپنے گھر دکھاؤ، مگر وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئے۔ جاپانی جب باہر والوں کو بلائیں گے، تو ہوٹل یا کلب میں۔ کبھی گھر پر دعوت نہیں دیتے، شاید ان کا خیال ہے کہ ہم جنگلی ان کے نازک نازک نفیس گھروں کو تہہ و بالا کر دیں گے، جاپانی صدیوں تک باہر کی دُنیا سے کنارہ کش رہے ہیں اور صرف پچھلے اسّی سال سے اُنہوں نے اپنے معاشرے کے دروازے باہر والوں کے لیے کھولے ہیں، لیکن ان کے گھروں کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ خیر میں نے بھی ڈھیٹ بن کر ایک گھر تو جھانک ہی لیا۔ برآمدے اور باورچی خانے میں نہایت عُمدہ لکڑی کا فرش، ٹائیلوں کی چھتیں، کمروں کے بیچ میں دیواریں ندارد، ہلکے ہلکے کاغذ کے دروازے جو ادھر اُدھر کھسک جاتے ہیں اور ہٹائے بھی جا سکتے ہیں، تاکہ کمرہ جس ناپ کا بنانا ہو بنا لیا جائے، کمرے میں خوبصورت چٹائیاں بچھی ہوئی، کوئی فرنیچر فالتو نہیں، محرابی صُورت کا ایک گوشہ عبادت کے لیے مخصوص ہے، جہاں ایک نہایت حسین طُغریٰ ٹنگا رہتا ہے، خوبصورت گُلدان میں پھُول، وہاں گھر والے خاموش بیٹھ کر دعائیں مانگتے ہیں، یا دل و دماغ کو سکون دیتے ہیں، خوشحال گھرانوں میں ایک

مغربی طرز کا کمرہ ضرور ہوتا ہے جس میں میز کرسیاں اور صوفے ہوتے ہیں جاپانی کمرے کا یہ فائدہ ہے کہ اسے کئی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سونا، کھانا، بیٹھنا، کھیلنا، پڑھنا، سب کچھ ایک کمرے میں ممکن ہے۔ ہمارے ایک سوئیڈش دوست سے جب ایک ہوٹل والے نے پوچھا کہ آپ مغربی کمرہ لیں گے یا جاپانی، تو وہ کچھ ترنگ اور کچھ تکلّف میں بولے: "جاپانی"۔ اندر پہنچ کر انہیں محسوس ہوا کہ اگر ذرا سا سر اٹھایا، تو چھت بھی ساتھ اٹھ جائے گی، ذرا ہلے تو گھر ہل جائے گا بچارا گھٹنوں کے بل چلتا تھا، گھٹنوں کے بل حجامت بناتا تھا، اتنے لطیف و نازک گھر میں انسان اپنے آپ کو خواہ مخواہ ایک بے ہنگم حیوان تصوّر کرنے لگتا ہے اور آئینہ بھی ڈر ڈر کر دیکھتا ہے کہ کہیں سینگ نہ نکل آئے ہوں۔ سرزمین جاپان آتش فشاں پہاڑوں پر واقع ہوئی ہے، اس لیے زلزلہ کے ڈر سے عام گھر ہلکے ہلکے بنائے جاتے ہیں۔ میرے سامنے بھی زلزلہ کے دو زبردست جھٹکے لگے تھے اور ساری عمارت دو منٹ تک ایک مدہوش شرابی کی طرح جھومتی رہی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی، لیکن چاروں طرف دیکھا تو عورتیں بدستور اپنے اپنے کام کر رہی تھیں۔

جب کسی عورت کو ہم بدصورت نہیں کہنا چاہتے، تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ اس کی شکل اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ ٹوکیو کی شکل بھی اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں کیوٹو کے بجائے ٹوکیو حکومت کا مرکز قرار دیا گیا اور جب سے اس کے شہری نقشہ میں کوئی ترتیب نمودار نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے ایک ناتراشیدہ درخت کے مانند اس کی شاخیں بے تحاشا پھیلتی جا رہی ہیں۔ پانی کا سمندر تو دیکھا تھا، مگر انسانوں کا سمندر جاپان میں دیکھا۔ یہ انسانی سمندر دفتر کے اوقات میں ٹیکسیوں، کاروں، رکشاؤں میں شور مچاتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔ ٹیکسیاں شہر کے ہر حصّہ میں ہزارہا ہیں میں نے امریکہ میں بھی ان کی اتنی افراط نہیں دیکھی، موٹروں کی کسی قطار میں عموماً ۵۰ ٹیکسیاں

اور دس ذاتی کاریں ہوتی ہیں اور بڑی سڑکوں پر چھ چھ ایسی قطاریں۔ ہجوم کے وقت ہر دو منٹ کے بعد ٹریفک پانچ منٹ تک رُکا رہتا ہے یعنی بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان پیدل چل لے، کار کی رفتار سے پانچ منٹ کا راستہ عموماً آدھے گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ دن کے خاص ازدحامی گھنٹوں میں نِکلتے ڈرتے ہیں۔ یہ تکلیف صنعتی ترقّی کی پہلی قیمت ہے، ٹوکیو میں ٹیکسی شاید دُنیا بھر سے ارزاں ہے، روپیہ سوا روپیہ میں آپ کو ٹیکسی والا کہاں سے کہاں پہنچا دے گا، لیکن اس میں دو امکانات اور بھی ہیں، اوّل تو غلط پتہ پر پہنچائے گا یا پھر عالمِ فنا میں پہنچا کے دَم لے گا۔

اگر آپ اس کی تیز رفتاری کے باوجود اپنی جان صحیح سلامت واپس لے آئے تو یا آپ کا امام ضامن نہایت زبردست ہوگا، یا پھر ٹیکسی کی بریکیں۔ میں تو اپنا سانس روک کر ٹیکسی میں بیٹھتی تھی اور آیۃ الکرسی کے بجائے یٰسین پڑھا کرتی تھی کہ موت سامنے منڈلاتی نظر آتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کسی انجمن خودکشی کا رکن رکین معلوم ہوتا ہے جو اپنی جان دینے اور دُوسروں کی لینے پر تُلا رہتا ہے، یہ طوفانی پُتلا ہزارہا کاروں اور بسوں کو چیرتا ہوا یُوں نکلتا ہے کہ سانس اُوپر کا اُوپر، نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے اور اس صُورتِ حال کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ آپ اس گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر منیجر کے سُپرد کر آئیں۔ یہاں کا مشہور ترین بازار "گنزا" کہلاتا ہے جو امریکی براڈوے کا جواب ہے۔ بے حد کُشادہ، چھ سڑکیں پہلو بہ پہلو لیٹی ہیں، دو طرفہ فلک بوس عمارتیں اور دُکانیں۔ آٹھ آٹھ منزل کے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور جو اپنے یورپی حریفوں سے کسی طرح کم نہیں اور ان میں طرح طرح کے مال، سُوئی سے لے کر صوفے تک "ڈرِکی موٹو" موتی سے لے کر موٹروں تک ہر شے نہ صِرف پائی جاتی ہے بلکہ اس نفاست سے سجائی جاتی ہے کہ انسان اس نمائش کدہ میں تصویرِ حیرت بنا پھرتا ہے۔ ہر منزل کے خودکار زینہ کے سرے پر دو دو زندہ گُڑیاں مُسکرا رہی ہیں، اگر ان سے کوئی فالتو بات پُوچھو کہ فلاں چیز

کس منزل پر بلتی ہے، تو شرما کر سُرخ ہو جاتی ہیں اور کھسیانی ہنسی ہیں "نو" (NO) کر دیتی ہیں، لیکن عورتوں کی بہتات ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ان کام کرنے والیوں کی تنخواہیں تو کم نہیں پھر بھی ہر دوکان پر ایک کے بجائے دو دو لڑکیاں، ہوٹلوں پر ایک میز پر دو دو کھلانے والیاں کھڑی ہیں۔ ہر عمدہ اسٹور کی پانچویں منزل پر نہایت اعلیٰ وسیع اور ستا رسیٹوران ہوتا ہے جس میں ہزار ہا مرد، عورتیں، بچّے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ کُھلی چھت پر نہایت خوبصورت باغ لگا ہوا ہے جہاں موسم خواہ کوئی ہو، لیکن بہار ہمیشہ چھائی رہتی ہے، چھت کے ایک حصّہ میں کئی سو لوگ رسمِ چائے ادا کر رہے ہیں (اس رسمِ چائے کے متعلق بعد میں بتاؤں گی)، ٹوکیو کا سب سے بڑھیا اور تازہ ترین سٹور ایک صنعتی کرشمہ ہے، اس کی ایک منزل کے نہایت کشادہ اور طرزِ جدید کے ایوانوں میں مجلسِ موسیقی جمتی ہے، تھیٹر دکھایا جاتا ہے اور مشہور فنکاروں کی نمائش ہوتی ہے۔ ایک منزل پر چڑیا خانہ ہے جس میں ہر قسم کے پالتو جانور خریدے جاتے ہیں۔ میرا وقت تو زیادہ تر تیسری منزل میں صرف ہوا جہاں بانس کے برتن، کانچ اور سیپ کے گلدان، سُنہری لاکھ کے عجُوبے اور نوادر خریدار کے دامن کھینچتے ہیں۔ بانس جیسے کُھردرے اور بے ہنگم مسالے سے کیا کیا باریکیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ عموماً بانس پر رنگ و روغن نہیں لگایا جاتا۔ وقت گزُرنے کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ خود بخود گہرا ہو جاتا ہے، ایک بڑھیا قسم کا بانس سیاہ بلکہ گہرا جامنی ہوتا ہے۔ بانس کا فرنیچر، ٹوکریاں، لیمپ شیڈ، بانس کی طشتریاں، پلیٹیں، بانس کے کانٹے چھُریاں، چاول کھانے کی لمبی لمبی ڈشیں، بانس کے گلدان۔ دل چاہتا تھا کہ گھر سارا بانس سے بنوالوں اور بانس کے پنگھوڑے میں جھولتی رہوں۔

"جاپان کے مِکی موٹو" موتی دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مَیں نے ان کی دُکان پر ہزار ہا لڑیاں مختلف قیمتوں اور قسموں کی دیکھیں، پچاس روپیہ کی لڑی سے لے کر پانچ لاکھ تک کی لڑی

بھی تھی، غریب کی گردن میں پچاس ہزار کی لڑی پانچ سو ہی کی لگے اور کسی پٹھانی کی گردن میں پانچ روپیہ کی دس ہزار کی لگے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اصل نقل کا فرق صرف پہچان والے ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے تو سارے موتی ایک ہی صدف سے نکلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے؛ چنانچہ میں نے موتی کا ایک دانہ بھی نہ لیا، ویسے جاپان میں انسان اپنے آپ کو لکھ پتی محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایک انگریزی پونڈ جو اندازاً سوا تیرہ روپیہ کا ہوتا ہے، اس کے بدلے میں جاپانی سکّے ایک ہزار "ین" ملتے ہیں۔ اس لیے میرا بٹوہ ہمیشہ پچاس ساٹھ ہزار "ین" سے بھرا رہتا تھا اور میں اپنے آپ کو رئیسہ سمجھ کر سر اُونچا کر کے چلتی تھی۔

ٹوکیو میں خرید و فروخت کا مزہ اس لیے زیادہ آتا ہے کہ اشیا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دُکانیں حسین، بیچنے والیاں خندہ لب اور خُوبرو، اس پر طرّہ یہ ہے کہ دو پیسے کی چیز کو بھی نہایت نفاست سے نہایت دل کش کاغذ میں ربن سے لپیٹ کر دیں گی، اکثر وہ کاغذ اس قدر حسین رنگ اور نمُونے کا ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کھول کر اندر نظر نہ ڈالی جائے یا کاغذ رکھ لے اور چیز پھینک دے۔ ہمارے مُلک میں اس قسم کے کاغذ پر عشّاق عطرِ روشنائی میں اپنا دل لپیٹ کر بھیجیں نہ کہ موزے یا چٹنی۔

جاپانی رسمِ چائے کے سمجھنے اور سراہنے کے لیے پہلے اپنا طریقۂ چائے نوشی دیکھنا ضروری ہے۔ انگریز ہمارے لیے دو بہترین روایتیں چھوڑ گئے ہیں۔ ایک ڈپٹی کمشنر اور دوسرے لپٹن کی چائے۔ پہلی کا حشر قریب ہے، دُوسری نے حشر برپا کر رکھا ہے۔ یہ لپٹن تو قوم کو ایسی لپٹی ہے کہ دیہاتی بھی اس کے چسکے میں پڑ گئے ہیں۔ خیر، تو انگریز نے چائے چھوڑی، پر چائے پینے کا کوئی ڈھنگ یا سلیقہ نہ چھوڑا۔ چائے آب خوروں میں پی، گلاسوں میں پی، دُودھ کے جگ میں پی، حجامت کے ڈونگے میں پی، کچھ پہلوان، تو بالٹیوں سے

مُنہ لگا کے پی جاتے ہیں۔ بعض کفایت شعار پیالیاں خریدتے ہی نہیں، سیدھا طشتریوں سے چائے سُڑپ لیتے ہیں۔ سگرٹ پان ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور مُنہ کے ساتھ زبان بھی چل رہی ہے۔
اس کے برعکس جاپانی رسمِ چائے ملاحظہ ہو۔ اوّل تو چائے ایک رسم ہے۔ مشروبات میں تو اتفاقاً شامل ہو گئی ہے۔ سولھویں صدی میں اس کے بنانے، بانٹنے اور پینے کے باقاعدہ قانون اور اصول لکھے گئے تھے۔ اگر وہ قواعد پڑھیے، تو آنکھیں گھوم کر سر پر اور سر گھوم کر کیتلی پر۔ رگ دید اکے منتر دہرانے آسان ہیں، لیکن اس رسمِ چائے کے اصُول یاد رکھنے مشکل۔ خیر آپ ڈریے نہیں، ہم کب یہ رسم ادا کرنے لگے ہیں؟ بہر حال ان سب حکایات کا ایک مقصد ہے اور وہ ہے جسمانی، روحانی اور ذہنی سکُون اور توازن کا قیام یعنی چائے ایک قسم کا یوگا ہے جو آسن جما کر آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ بُوند بُوند پُورا ہوتا ہے۔ خیر سامعین تو بعد میں آئیں گے، پہلے چائے کے لوازم ملاحظہ کیجیے۔
سیاہ لوہے کی ایک بھاری انگیٹھی، ٹین کے ڈبوں میں بند پِسی ہوئی چائے، سبز پاؤڈر کی طرح۔ کئی قسم کے بانس کے چمچے۔ خوبصورت چینی کے کئی گول پیالے جن پر نہایت حسین منظر کھنچے ہوں، پھینٹنے کے لیے بانس کی ایک مدھانی اور کچھ مٹھائی اور ان سب لوازم کے سامنے چائے کی دیوی گڑیا کی طرح سجی ہوئی بیٹھی ہے، اسے بچپن سے چائے بنانے کا رازِ سربستہ بتایا گیا ہے، ہر چمچہ کس طرح اپنی جگہ سے اُٹھایا جاتا ہے کس طرح رکھا جاتا ہے، پھر سبز چائے کا پوڈر کس طرح پھینٹا جاتا ہے اور کس طرح اس میں گرم پانی ڈالا جاتا ہے، پھر یہ محلول کس طرح پیالیوں میں ڈالا جاتا ہے اور کس طرح مہمانوں کو پکڑایا جاتا ہے اور پھر کس طرح مہمان اس حسین پیالی کے رنگ اور نمونے کو سراہتا اور پیالی ہاتھ میں لے کر گھماتا ہے۔ ہر حرکت کے لیے الگ قانُون اور سلیقہ ہے، ذرا سی بھی غلطی کی گنجائش نہیں۔ سامعین خاموش بیٹھے ہیں یوں معلوم ہوتا کہ "یواین او" میں کسی لیڈر کی موت پر تعزیتی خاموشی کا عالم ہے، لیکن ہندو رشی مُنی اس کو شانتی کہتے

ہیں۔ یہ رسم ہر نئے مہمان کے لیے ادا کی جاتی ہے، ہر گھر میں ہوتی ہے، ہر باغ میں ہوتی ہے، بڑی بڑی دُکانوں میں ہوتی ہے، اس سے کہیں فرار نہیں اور اسے مذہبی وقار دیا گیا ہے اور اس کے لیے اک فضا قائم کی جاتی ہے۔ اگر چائے باغ کے پاس نہیں جا سکتی، تو باغ چائے کے پاس آجاتا ہے۔ جاپانی باغ کا چل کر آجانا مشکل بھی نہیں ایک چٹائی مٹی کا ایک ڈلا، تھوڑا سا پانی، ننھّا سا فرن اور پھول، اگر باغ نہ بھی ہو کم سے کم گلدان سامنے ہو اور ایک خوبصورت سا نوشتہ ہو جس کے رنگین منظر پر ٹکٹکیاں جمی ہوں، سب اس سے محظوظ ہو رہے ہوں اور چائے نوش فرما رہے ہوں۔ یہ سب تو ہوا لیکن خود یہ چائے کس قماش کی ہے، کس مزے کی ہے؟ دیکھنے میں پسی ہوئی مہندی اور پینے میں کونین، جاپان میں جس رفتار سے یہ پی جاتی ہے ملیریا کا نام ونشان مِٹ جانا چاہیے، کسی مچھّر کی شامت ہی آجائے جو جاپانی خُون چوُسے، کم بخت باری کے لرزے میں چل بسے گا۔ ویسے تو یہ چائے قہوہ کی طرح رقیق ہوتی ہے، لیکن خاص مہمانوں کے لیے خوب گاڑھی بنائی جاتی ہے اور اس میں خوشبو بھی مہندی کی جیسی ہوتی ہے۔ جس وقت یہ گاڑھا گاڑھا گرم جوشاندہ میرے سامنے پیالی میں آیا، تو میں نے سہم کر میاں کو دیکھا، اُنھوں نے گھُورا کہ پی جاؤ، آخر سقراط نے بھی تو دل رکھنے کو زہر کا پیالا پی ہی لیا تھا۔ میں نے مُنہ میں اُلٹایا تو نہ اُگلے بنے نہ نِگلے۔ پیٹ کی انتڑیاں کھینچ کر باہر، اس پر تازیانہ یہ کہ فوٹوگرافر کیمرہ تانے کھڑا تھا گھگیا کر جھوٹی ہنسی ہنس دی۔ وہ فوٹو اس وقت بھی میرے پاس ہے آنکھوں میں حقیقت ہونٹوں پر فریب، خدا دُشمن کو بھی وہ کڑوی زہر گاڑھی مہندی نہ پلوائے، لیکن اس سبز چائے نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، ہر ہوٹل میں سب سے پہلے یہ میز پر دھر دی جاتی ہے۔ بڑے ریسٹورانوں میں ہر میز پر مفت، جگوں اور کیتلیوں میں بھری رکھّی ہوئی ہے۔ لوگ پانی کی طرح غٹا غٹ پیے جاتے ہیں۔ اللہ انہیں عالمِ غیب سے پُورا پُورا اجر دے۔

ہر ملک اپنے مخصوص کھانوں کے لیے مشہور ہے، ہمیں بتایا گیا تھا کہ TEMPURA یعنی تلی ہوئی مچھلی یا سبزی یہاں کی خاص الخاص شے ہے، یہ گہرے گہرے بناسپتی گھی کے کڑھاؤ میں دھیمی دھیمی آنچ پر بیسن کی طرح ایک قسم کے آمیزے میں تلی جاتی ہے اور اس کے لیے گاہک کو کم از کم آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا ہے، پھر گرم گرم پلیٹ آتی ہے، ٹیم پورہ میں جھینگے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی چیز نہ تھی، بالکل پھیکے پکوڑے جیسا مزہ تھا۔ "سکی یاکی" ایک مشہور ڈش ہے۔ گائے کے گوشت کے پتلے پتلے پارچے جو سامنے تل کر کھلائے جاتے ہیں۔ جاپانی کھانا بہت تزک اور اہتمام سے کھاتے ہیں، گھروں کا تو پتہ نہیں لیکن ہوٹلوں میں ہم جونہی جا کر بیٹھے مسکراتی ہوئی تین چار گڑیاں آگئیں۔ ایک نے سبز چائے (اِنَّا لِلّٰہ) کا کیتلا اور پیالیاں سامنے سجائیں، دوسری بھیگے بھیگے گرم بھبکتے ہوئے تولیے طشت میں سجا کر لائی اور ہمارے ہاتھ پونچھے۔ تیسری نے پلیٹ اور بانس کی بنی ہوئی کھانا کھانے کی تیلیاں سامنے رکھیں، چوتھی نے گیس کا چولہا لا کر میز پر جلایا، پھر پہلی نے سکی یاکی کے لوازم، کٹی ہوئی پیاز، بانس کی کونپلیں، پھلیوں کا دہی، مصالحہ، کالی مرچ، نمک، گھی اور گائے کے گوشت کے پارچے۔ اب وہ مسکرا مسکرا کر اپنی میٹھی میٹھی آواز اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مُنّی مُنّی سوال و جواب کرتی جا رہی ہے، سامنے گرم گرم گوشت روسٹ ہو رہا ہے۔ بھوک بڑھ رہی ہے، میری تو خوشبو سے اور میاں کی اس گڑیا کی مسکراہٹوں سے "سکی یاکی" کو اسّی فیصد نمبر دے کر پاس کر دیا۔ ہمارے نکّوں کا جواب ان کے پاس "یاکی توری" ہے۔ مُرغی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو مرچ نمک لگا کر سیخوں پر بھونے جاتے ہیں اور خاصے مزیدار ہوتے ہیں۔ جاپانی کھانا عموماً دیکھنے میں عمدہ اور سُننے میں اس سے بھی اچھا ہوتا ہے۔ ہر ڈش کی سجاوٹ

الگ ہوتی ہے اور کھانے چٹخارے لے لے کر، سڑپّے مار مار کر کھائے جاتے ہیں اور دُور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بآوازِ بلند داد دی جا رہی ہے۔ سُنا ہے کہ اچھے دستر خوان پر گُل ِداؤدی کا اچار بھی ہوتا ہے۔ یہ سب امیروں کے کھانے ہیں۔ عوام اور پیشہ ور تو اُبلے چاول اور کچّی مچھلی پر ہی پلتے ہیں۔

(۲)

جاپانی قوم آفتاب پرست، بحر پرست، جنگ پرست اور شہنشاہیت پرست رہی ہے، صدیوں کی ظلمت اور جنگ جو فتنہ پرور سرداروں کی مخاصمت کے بعد ۱۸۸۸ء میں بادشاہت کے عہدِ جدید کا آغاز ہوا۔ جاپان کی صنعتی ترقّی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے، اور جاپان سُرعت کے ساتھ رنگِ جدید میں رنگا جاتا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں چین کو اور ۱۹۰۴ء میں رُوس کو شکستِ فاش دے کر جاپان نے ایشیا پر اپنی دھاک بٹھا دی، اور خصوصاً سفید فام رُوسیوں کو ہرا کر گوری چمڑی کی برتری ختم کر دی۔ پھر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دے کر دُنیا کی پانچ بڑی قوموں میں شمار ہونے لگا۔ دُوسری عالمگیر جنگ میں ۱۹۴۵ء کی شکست بھی دراصل جاپان کی فتح تھی کہ اگر یہ شکست نہ ہوتی، تو شاید جاپان کی صنعتیں اتنی تیز رفتاری سے ترقّی نہ کر سکتیں۔ امریکہ نے اگرچہ اپنے شکست خوردہ حریف کی کروڑوں ڈالروں سے امداد کی اور ہر نوع کی مشینری بھی لگائی، لیکن جاپان سے ایک ایسا عہد نامہ کر لیا کہ وہ نہتّا ہو جائے اور کسی قسم کی جنگ کا امکان نہ رہے، نتیجہ یہ ہُوا کہ جاپان نے سارا بجٹ قومی اور صنعتی ترقّی پر خرچ کیا اور ایک کوڑی بھی تحفظ یا فوجی نظام پہ ضائع نہ کی۔

صنعتی ترقّی کی دُوسری وجہ جو مجھے بتائی گئی وہ یہ تھی کہ حکومت نے سب سے

پہلے بھاری صنعتیں قائم کیں اور بھاری صنعتوں سے قوم بتدریج ہلکی صنعتوں کی طرف مائل ہوئی۔ یہ میلان بیشتر ایشیائی ملکوں کی اقتصادی پالیسی کی ضد ہے، ابتدا میں وہاں کی حکومت نے خود بھاری بھاری صنعتیں قائم کر کے بڑے بڑے امیر کاروباری خاندانوں کے ہاتھ فروخت کر دیں جو پہلے ہی سے کاروبار میں مصروف اور ناتجربہ کاری میں ٹامک ٹوئیے مارنے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کے خطرے سے محفوظ تھے۔ اس طرح جاپان بہت جلد بیرونی مدد سے بے نیاز ہو گیا اور اس کی صنعت خود رو ہو گئی اور اب اپنے ہی برتے پر دن دونی رات چوگنی ترقّی کرتی جا رہی ہے۔ پھر ملک کی صنعتی ترقّی کے ساتھ ساتھ زرعی ترقی بھی ہوتی رہی اور حکومت نے دیہات کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کیا جس کے باعث جاپان کی دیہاتی آبادی خوب خوشحال ہے اور صنعتی مال کی اہم خریدار۔ اور یہ بھی اس ملک کی ترقّی کا ایک بڑا راز ہے کہ دیہات میں رہنے والی اکثریت اس معیار اور مذاق کی ہے کہ شہری مارکٹ کی بہت بڑی گاہک بن گئی ہے۔ ایک اور وجہ اس حیرت انگیز ترقّی کی یہ بھی ہے کہ جاپان نے دس سال کے اندر اپنی شرح پیدائش کو آدھا کر لیا جہاں ہر سال کھانے والوں کی تعداد میں دو فیصد اضافہ ہوتا چلا جائے، وہاں تیز رفتار ترقّی ممکن نہیں۔ جاپان میں اسقاط کرنا جرم نہیں، یا کم از کم پولیس اِسے جرم نہیں سمجھتی۔ اس کے علاوہ ہیروشیما کے سانحہ کے بعد کچھ بچّے اپاہج پیدا ہوئے جس سے خوف زدہ ہو کر لاکھوں مردوں اور عورتوں نے اپنے اپنے آپریشن کروا لیے۔ ویسے بھی یہ قوم زندہ، ہوشیار اور باخبر ہے! اور موجودہ مسائل کے پیش نظر اپنے کنبوں کی تعداد بڑھنے نہیں دیتی۔

جاپان کی صنعتی ترقّی ایک کرشمہ معلوم ہوتی ہے۔ یقین ہے یہ قوم چند سال میں یورپ سے پھر ٹکر لے گی۔ اس وقت بھی جاپان نے بحری جہاز سازی میں انگلستان

کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دُنیا میں بحری جہازوں کا سب سے بڑا کارخانہ جاپان ہی میں ہے، صنعتی میدان میں جاپان جرمنی سے بھی ٹکّر لے رہا ہے، کیمروں کے جاپانی لینز جرمن لینزوں سے بہتر ہیں۔ اس کے ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹرانزسٹر، فریجڈیر، دُوربین، ریڈیوگرام یورپین اور امریکی معیار پر پُورے اُترتے ہیں اور قیمت میں کہیں سستے ہیں، جاپانی کار ریشم اور خاص طور پر شاموز مشرقِ بعید کے مُلکوں میں خاص طور پر مرغوب ہے اور فراوانی سے مِلتا ہے۔ اللہ کی شان کہ جس جاپانی مارکہ کو کبھی حقارت سے دیکھا جاتا تھا، اب وہ خود ایک معیار بن چُکا ہے۔ ہمارے بچپن میں جاپان ایک قسم کی گالی سمجھی جاتی تھی، آج وہی لفظ دُنیا کی تجارت میں عزّت رکھتا ہے۔ جاپانی کارخانے اِس طرح سے مال اُگل اُگل کے پھینک رہے ہیں کہ ان کے اپنے شہر اور دکانیں سنبھال نہیں سکتے۔ کئی دُکانوں پر مال اُبل اُبل کر سڑکوں تک پہنچ جاتا ہے؛ البتّہ ایک شے باہر والے نہیں خریدتے اور وہ ہے جاپانی موٹر کار۔ نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں لاکھوں موٹر گاڑیاں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہیں اور یہی کیفیّت رہی، تو آج سے چند سال بعد کار ٹھہرانے کی جگہ نہیں ملے گی۔

اس صنعتی ترقّی کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان کا معیارِ زندگی ایشیا میں سب سے اُونچا ہو گیا ہے۔ بے روزگاری برائے نام ہے اور تعلیم عام۔ ہر دُوسرے گھر میں ٹیلی ویژن موجود ہے۔ ہم ان کے دیہات میں گئے، تو وہاں تقریباً ہر گھر میں ٹیلی ویژن، سینے کی مشین، ریڈیو، کپڑے دھونے کی مشین، ٹریکٹر، بائیسکل اور اعلےٰ درجہ کے زرعی اوزار موجود پائے۔ تین ایکڑ زمین کے مالک ایک اوسط درجہ کے کسان کے گھر میں جا کر پُوچھا، تو اس کی خالص آمدنی سب خرچ نکال کر تقریباً آٹھ سو روپے ماہوار تھی۔ جاپانی

کسان زمین کے چپے چپے سے چیز اُگاتا ہے، ایک انچ بھی ضائع نہیں کرتا۔ درختوں پر بہت سا ساز و سامان ٹانگ دیا جاتا ہے تاکہ زمین نہ گھرے اور پیداوار کے فضلے سے بھی کوئی نہ کوئی چیز پیدا کر دی جاتی ہے۔ خاندان کا بچّہ بچّہ کام کرتا ہے اور کمانے میں عار نہیں سمجھتا۔ عورتیں صنعت کا دایاں بازو ہیں اور اپنے فالتو وقت میں نوکریاں کرتی ہیں، اِن ہی عورتوں کے بَل پر گھریلو صنعتیں چل رہی ہیں، جاپان کو نقّال تو کہتے ہیں، لیکن وہ اتنی اعلےٰ نقّالی کرتا ہے کہ سوئیڈن کا کانچ، جرمنی کی کپڑا بُننے والی مشین، اور انگلستان کے تیار شُدہ کپڑے کا ہو بہو نمونہ بنا کے دکھا دیتا ہے اور میری ناچیز رائے میں ادنیٰ درجے کی جدّت سے اعلےٰ درجے کی نقّالی بہتر ہے۔

ایک انگریز نامہ نگار نے لکھّا ہے کہ باوجود اس بات کے، کہ جاپان کے پاس اپنے قدرتی ذرائع ناپید ہیں نہ لوہا ہے نہ لکڑی، نہ کوئلہ ہے نہ تیل، پھر بھی اس کی صنعتی پیداوار ۱۹۵۲ء سے لے کر اب تک دُنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اِس دور میں اُس نے رُوس اور جرمنی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جنرل میک آرتھر نے دو احسان جاپان پر کیے ہیں، ایک تو زرعی اصلاح اور دُوسری تعلیمی اصلاح۔ ایک اصلاح کے تحت بڑی بڑی زمینداریاں ختم کر کے چھوٹے چھوٹے کسانوں میں بانٹ دی گئی ہیں، اب ان کسانوں کو آسانی سے قرضے مل جاتے ہیں اور قرضوں کے ساتھ فنّی امداد بھی۔ اس کے علاوہ کسان کی اپنی عرق فشانی اور ذہانت سے بھی دیہاتی معیارِ زندگی بہت اُونچا ہو گیا ہے۔

شہروں میں کارخانے کے مزدوروں کی اُجرت گزشتہ سات آٹھ برس میں دُگنی سے زیادہ ہو گئی اور ان کے کام کے گھنٹے کم ہو گئے ہیں، چھٹیاں، انعام، انشورنس اور

مُفت ڈاکٹری امداد مُہیا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے مشہور کارخانے دار اپنے مزدوروں سے پدرانہ سلوک کرتے ہیں، لیکن چند علاقوں اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کے مزدوروں میں ابھی تک غُربت اور تنگی ہے۔ ٹوکیو کی سڑکوں پر گروی رکھنے کی ہزاروں دکانیں نظر آتی ہیں، جہاں مزدور اپنی چیزیں گروی رکھتے ہیں اور کچھ تو کام پر جاتے وقت اپنے اُبلے ہوئے چاول کا پیالا ہی گروی رکھ جاتے ہیں، جو واپسی پہ مزدوری ملنے پر چھڑا لیتے ہیں۔

شہنشاہیت کی قدیم اور باوقار روایت کے باوُجود اکثریت نے جمہوریت قبول کر لی ہے؛ البتّہ جمہوریت کی نقل و شکل کے بارے میں کچھ اختلاف رائے ہے۔ یہاں تین اہم سیاسی گروہ ہیں: "لبرل ڈیموکریٹک پارٹی" جو اس وقت برسرِ اقتدار ہے، وہ بہت ہر دل عزیز معلوم نہیں ہوتی حالانکہ دارالعوام اور مجلسِ مشاورت میں اس کے اراکین کی اکثریت ہے۔ دُوسری سوشلسٹ پارٹی ہے، جو دس لاکھ ہم خیال اراکین کی موجودگی کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ پارٹی خوب زوروں پر ہے۔ اس کے رضا کار اور اراکین زیادہ تر طالب علم، اساتذہ، یونیورسٹی کے پروفیسر اور مزدور پیشہ لوگ ہیں، یہ پارٹی فی الحال موجودہ حکُومت کو ہٹا تو نہیں سکتی؛ البتّہ اُسے ہلا ضرور دیتی ہے، وہ پُرامن بغاوت کے ذریعے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو ہٹا کر ایک ایسی سوشلسٹ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، جو معاشرتی سلامتی پر مبنی ہو۔ یہ امریکہ کے ساتھ معاہدوں کے سخت خلاف ہے۔ تیسری پارٹی جو اسی کی ایک شاخ تھی، اب ایک جُدا حیثیت اور اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے، اس کا نام ڈیموکریٹک سوشلسٹ پارٹی ہے۔ یہ نہ دائیں طرف ہے اور نہ بائیں طرف۔ اس کا عقیدہ امن اور غیر جانبداری ہے

اور عمل اعتدال۔ یہ ایک طرف تو موجودہ حکومت کی تنقید اور مذمت کرتی ہے، دوسری جانب سوشلسٹ پارٹی کی بے اعتدالیوں کو بُری نظروں سے دیکھتی ہے۔ اسمبلی میں تعداد کے لحاظ سے اس کا درجہ تیسرا ہے۔ اس کے بعد انڈی پنڈنٹ، اور آخر میں کمیونسٹ؛ البتہ یہ بات قابلِ تشویش ہے کہ پچھلے دو تین سال میں حشرات الارض کی طرح کوئی ایک سو کے قریب چھوٹی چھوٹی نہایت قدامت پسند پارٹیاں پھر زندہ ہوگئی ہیں۔ یہ فتنہ جنگ کے بعد بالکل دبا دیا گیا تھا، لیکن اب دوبارہ ابھر آیا ہے، ان سب کٹر پارٹیوں کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے جاپان کو ایشیا کا لیڈر اور ایک بڑی بھاری فوجی طاقت بنانا، شہنشاہیت کو ازسرِ نو خدا بنا کے پُوجنا، اور جمہوریت کو بدیشی فلسفہ قرار دے کر جلاوطن کر دینا۔ یہ ننھّے ننھّے مہلک گروہ ہندوستان کی جن سنگھ کی طرح تعصّب، نفرت اور تشدّد پھیلاتے پھرتے ہیں۔ ان کی خُفیہ مجلسوں میں مختلف اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے، طرح طرح کی خونیں قسمیں دلوائی جاتی ہیں اور ان کے نزدیک سیاسی حریفوں کا قتل ثواب ہے۔ ایک پولیس افسر کا بیان ہے کہ کمیونسٹوں سے زیادہ یہ دیوانے خطرناک ہیں۔ اس قسم کی پارٹیوں کا برسرِ اقتدار آنا تو ناممکن ہے، لیکن یہ ہمیشہ بدامنی پھیلاتی اور ہر ترقّی پسند نظامِ حکومت کے لیے ایک لعنت بنی رہیں گی۔

جاپان میں تین اہم مذہب ہیں: شنٹو مت، بُدھ مت اور مسیحیت۔ شنٹو مت میں کچھ تو فطرت کی پرستش ہے اور زیادہ تر اپنے آبا و اجداد کی رُوحوں کی۔ کسی جاپانی کے لیے اس کے باپ اور دادا ہمیشہ زندہ ہیں۔ وہ ان کی روحوں سے مندروں میں جاکر ہمکلام ہوتا ہے، ان کو روپیہ اور کھانا پہنچاتا ہے۔ ان سے صلاح و مشورہ

طلب کرتا اور مرادیں مانگتا ہے۔ عیسائی مذہب اس ملک میں اس لیے عام نہ ہو سکا کہ پادریوں نے یہ اعلان کر دیا کہ نجات صرف ان کو ملے گی جو عیسائی ہوں گے۔ کوئی جاپانی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ تو جنّت میں چلا جائے اور اس کے باپ دادا دوزخ میں سڑتے رہیں، کیونکہ وہ عیسائی نہیں تھے؛ چنانچہ عیسائیت سے زیادہ یہودی مذہب کی طرف لوگ راغب ہو رہے ہیں۔ یہودی ذرا زیادہ فراخ ذہنیت اور فراخ فلسفہ رکھتے ہیں، علاوہ ازیں عیسائی پادری مذہب اور اخلاق کو مخلوط کر دیتے ہیں، اور اہلِ جاپان مذہب کو اتنا قریب لانا نہیں چاہتے کہ وہ ان کی اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہو۔ ایک جاپانی اپنا مذہب برائے نام رکھنا چاہتا ہے۔ شنٹو مندر میں اگر بتی، لوبان پھول رکھّے ہوئے ہیں۔ پجاری بیٹھے سگرٹ پی رہے ہیں، لوگ پیسے پھینکتے ہیں، تالیاں بجاتے اور گھنٹیاں ہلا ہلا کے دیوتاؤں کو متوجہ کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کو متوجہ کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، لیکن ان کے دیوتا شاید اُونچا سنتے ہیں، اگرچہ جب بھی سُنتے ہیں پُورا سُنتے ہیں اور جو مانگو وہی دیتے ہیں، ہمارے دیوتاؤں کی طرح سُنی اَن سُنی نہیں کرتے۔ ہمارے دیوتا شاید ہم سے ناراض ہیں اور جائز طور پر ناراض ہیں۔
بُدھ مت کوریا سے چودھویں صدی میں آیا اور کئی فرقوں اور کئی شکلوں میں بٹ گیا۔ جاپان کے ہر معاشرتی پہلو میں اس کا اثر نظر آتا ہے اور گوتم بُدھ کے شاندار بُت جگہ جگہ نظر آتے ہیں، مجھے یہ سُن کر ازحد مسرّت ہوئی کہ پچھلے چند سالوں میں چند تبلیغی پارٹیوں کے مجاہدوں نے ٹوکیو کے گردو نواح میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی ہے، جب میں وہاں تھی، تو یہ خوشخبری آئی کہ ایک گاؤں کا گاؤں مشرف بہ اسلام ہو گیا ہے، ایک جاپانی خاندان کے چاروں افراد مسلمان ہو گئے، لیکن اس خاندان کے ایک بزرگ نے کہا کہ

میں مُسلمان تو ہوں، لیکن مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا، پُوچھا کیوں؟ کہنے لگا میں شنٹو پادری ہوں اور پادری بننے کی الیکشن آ رہی ہے۔ اگر میں نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا، تو الیکشن ہار جاؤں گا، ذرا جیت لوں تو پھر، یہ سُن کر میں حیران رہ گئی کہ یہ خدا اور رسُولؐ کا کلمہ زبان پر رکھ کر کس مُنہ سے دہریت کے منبر پر بولے گا۔

جاپانی زبان میں زیادہ تر حروف جن کو کریکٹر کہا جاتا ہے، چینی ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ جاپانی رسم الخط چینی زبان سے اخذ کیا گیا ہے اور جاپانی اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی زبان اور تہذیب چین سے گھوڑے کی پیٹھ پر لاد کر یہاں لائی گئی تھی۔ کلچر کی درآمد کے لیے پرمٹ کی ضرورت نہیں۔ کچھ جاپانی جرنیل چین کے حصّوں کو مسخّر کر کے وہاں کے مالِ غنیمت کے ساتھ ان کی زبان اور معاشرت بھی اُٹھا لائے۔ بہر حال جاپانی زبان میرے کانوں کو عجیب عجیب آوازوں کا مرکب لگی، جاپانی "ل" اور "ر" دونوں کو ساتھ ملا کر نہیں بول سکتے۔ مثلاً ہماری رہبر ایک ریل گاڑی کی طرف اشارہ کر کے ہمیں بتا رہی تھی کہ یہ "جاپانی لیر وے" ہے۔ مجھ سے پُوچھنے لگیں "آپ راہول سے آئی ہیں۔" انگریزی میں پُوچھا آپ "LICE" کھاتی ہیں۔ میں نے کہا تمہارے مُنہ میں خاک۔ ہم غریب ہیں پر اتنے بھُوکے نہیں۔ جاپانی ہر لفظ کے آگے "سان" لگاتے ہیں جس کے معنی ہیں شریف۔ مثلاً آیا، ڈرائیور، چپراسی سب کے ناموں کے آگے شریف، ہمارے پاکستانی دوست کا خانساماں ان کو کھڑے کھڑے نوٹس دے کر چلا گیا کہ آپ لوگ اپنے نوکروں کی عزّت نہیں کرتے ہیں۔ مجھے خالی نتھّو کہہ کر پکارتے ہیں، جاپانی مجھے نتھّو شریف کہتے ہیں، لیکن اس کو خبر نہیں کہ جاپانی بندر کو بھی بندر شریف کہیں گے اور چائے کو بھی "چا سان" کہیں گے ایک اور گڑبڑ یہ ہے کہ ان کی گرامر

میں ماضی، حال، مستقبل کی تمیز نہیں ہے۔ ایک انجان کے پلّے یہ نہیں پڑتا کہ دوسرا مر رہا تھا، یا مر رہا ہے، یا مر چکا۔

جاپانی صدیوں سے اپنے جزیرے کی ریاست اور فسادات میں مصروف اور اپنی خود ساختہ علیحدگی میں مگن رہے ہیں۔ اس لیے نئی زبان سیکھنے کے لیے تیّار نہیں ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ پچھلے سو سال سے یورپ اور امریکہ سے تجارتی تعلّقات قائم ہیں۔ پچھلی جنگ کے بعد امریکہ نے دس سال تک اپنی فوجیں یہاں رکھ کر حکُومت کی ہے۔ انگریزی زبان کے لیے بیشمار اسکُول دن اور رات چلائے ہیں۔ اس وقت بھی انگریزی سکھانے کی موٹر گاڑیاں گھومتی پھرتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انگریزی پڑھانے کی جماعتیں ہوتی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود جاپانیوں نے انگریزی نہ سیکھی، یعنی ٹوکیو جیسے دارالسلطنت میں جہاں سیاحوں کے طفیل بے حساب رونق اور روزگار ہے، ایک قدم اکیلے چلنا مشکل ہے۔ اگر راستہ بھُول جاؤ، تو کوئی بتانے والا نہیں، ٹیکسی والے کو انگریزی نہیں آتی۔ لاکھ سر پٹکو، نہ وہ ہماری سمجھے اور نہ ہم اُس کی۔ ہر دُکان پر بنے تلے سوال کا جواب "جی" یا "نہیں" اگر ذرا کوئی بات تفصیل سے پُوچھنا چاہو، تو جب تک اندر دفتر میں سے کوئی ان کا افسر یا منیجر نہ بلوایا جائے، بے بس کھڑے رہیں، جو رہبر دیے جاتے ہیں اُن کی انگریزی ٹوٹی پھُوٹی۔ انٹرویو کیلیے جو رپورٹر آتے ہیں، وہ خود کورے، انگریزیت آگئی، مگر انگریزی نہ آئی۔ کمبخت امریکی زبان ہی سیکھ لیتے تو گزارا ہو جاتا۔ اب جاپان میں آنے والے بین الاقوامی کھیلوں کے لیے سُنا ہے کہ لڑکیاں لڑکے انگریزی کے مختصر کورس لے رہے ہیں، تاکہ نوکریاں آسانی سے مل جائیں۔

ٹوکیو جانا اور کابوکی تھیٹر نہ دیکھنا ایسا ہی ہے کہ محرم میں لکھنؤ جانا اور امام باڑہ نہ دیکھنا۔ کابوکی تھیٹر صدیوں کی روایات کے ساتھ ابھی تک رقصاں و درخشاں ہے۔ اس کے ڈراموں کے سارے کردار (نسوانی پارٹ کے لیے بھی) صرف مرد ہوتے ہیں اور لیلیٰ مجنوں کی قسم کے فرسودہ رومان اور قصّے گھڑ کے پلاٹ تیّار کیے جاتے ہیں۔ جن میں ناچ گانا بھی شامل ہوتا ہے۔ ہم کو مکالمے کا تو ایک لفظ بھی پلّے نہ پڑا لیکن جنہوں نے زبان سیکھی ہے وہ بھی نہ سمجھ پائے کہ ہو کیا رہا ہے۔ چیخنا، چلّانا، رونا، گانا، دہاڑنا، بڑبڑانا، کڑکڑانا سب چلتا رہا، ڈرامہ بھی چلتا رہا، بلکہ رینگتا رہا، لیکن نہ ہل سکے، تو سامعین اور حاضرین جو کرسیوں سے جُڑے بیٹھے رہے پانچ گھنٹے ہو گئے، ڈرامہ چل رہا ہے، آدھی رات ہو گئی ڈرامہ چل رہا ہے۔ خُدا یہ "کابوکیت" انہی کو مُبارک کرے ہمیں جو بھایا، تو وہ اُن کا "تکارزو" تھیٹر جس میں صرف عورتیں بلکہ لڑکیاں (شادی شدہ عورتوں کو نوکر نہیں رکھا جاتا) کام کرتی ہیں۔ یہ تھیٹر کابوکی تھیٹر کے برعکس ہے، وہاں صرف مرد ہیں، یہاں صرف لڑکیاں۔ یہ لڑکیاں نہایت وجیہہ اور شاندار ہیرو بنتی ہیں اور تلوار بازی، کشتی، مکّہ بازی میں رستمِ زماں ہیں۔ یہ تھیٹر دُنیا میں گھوم آیا ہے اور خوب دھوم مچا کر آیا ہے۔ بجلیوں کی طرح چار سو حسین شعلہ جوالا لڑکیاں ایک دم اسٹیج پر اس طرح کوندتی ہیں کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، انسان دَنگ رہ جاتا ہے، ایک وقت میں اتنی حسین لڑکیاں اور اتنے دل کش اور خوش نما حسین لباس میں، میں نے اسٹیج پر بہت کم دیکھی ہیں، ایک مُسلسل پرستان ہے۔ ان میں دو جوڑے جڑواں بہنوں کے ہیں، جو بال بال ایک ہیں، چند اُونچی آواز کی لڑکیاں نہایت بارُعب ہیرو بنتی ہیں اور ان پر حاضرین میں سے ہزاروں لڑکیاں، ہزار جان سے

عاشق ہو جاتی ہیں اور باقاعدہ پھول ہار بطور تحفہ بھجواتی ہیں، میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک دو لڑکیوں کو اُڑا لاؤں تاکہ ہمارے فلمی ایکٹروں کو سکھایا جائے کہ ہیرو کیسے بنتے ہیں، اتنے اعلیٰ پیمانے کے شو میں نے یورپ میں بھی کم دیکھے ہیں، تھیٹر کی ہر نشست پر ایک گدی ہے، جس میں سُننے کے لیے دو پلگ لگے ہوئے ہیں، ان کے ذریعے جاپانی مکالمہ کا بیک وقت انگریزی ترجمہ بھی سُن سکتے ہیں؛ البتہ جاپانی باتونی مشرقیوں کی زبان ہے اور انگریزی ایک کم گو قوم کی۔ جاپانی کے پانچ منٹ کے مکالمے کا ترجمہ ایک منٹ میں ہو جاتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاپانی زبان بیٹری کے پلگ میں سے سکڑ سکڑ کر نکل رہی ہے۔ ٹوکیو کی رات کی رنگینیاں الف لیلیٰ کی افسانوی راتوں کو مات کر چکی ہیں یہاں ایک سیاح کو دو کام کرنے چاہئیں۔ اپنی چیک بُک ساتھ لے آئے اور ضمیر گھر میں چھوڑ آئے۔

تفریح بادا کے مول ہے۔ اس کے باوجود دنیا کے مردانِ عیش کوش دن رات لہو و لعب میں کھوئے رہتے ہیں۔ ٹوکیو میں ہزارہا ہوٹل ہیں اور ان سے کہیں زیادہ گیشا خانے اور سرائیں، دو تین بڑے ہوٹلوں کے سوا سب ہوٹل والے اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے کاروبار کا صرف کھانے پلانے پر انحصار رکھیں، تو دیوالیہ نکل جائے، ہم تو اپنے کمروں سے دن کو بھی اور رات کو بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں، بلکہ کمرے گھنٹوں کے حساب سے کرائے پر دیے جاتے ہیں، جن میں طوائفیں مہیّا کی جاتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹوکیو میں عیّاشی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے۔

جاپان کو پہلی جنگِ عظیم کے بعد مشرق کا جنٹلمین یعنی سب سے مہذب مُلک قرار دیا گیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد دُنیا کا ظالم ترین قصاب ٹھہرایا گیا۔ ان دونوں مبالغوں

کے درمیان کچھ گنجائش ہے اور اگر غور سے تاریخ کے اوراق دہرائے جائیں، تو شاید دونوں بیانات سچ ہوں۔ یہ قوم جنگجو اور جنگ پرست ہے اور ہمیشہ اس کی نظر ہمسایہ کی ملکیت پر رہتی ہے۔ جو ظلم، تشدد، سفاکیاں اُس نے چین، برما، ہانگ کانگ اور کوریا میں کی ہیں، ان کا حال پڑھنے اور سُننے سے انسانی تہذیب لرز جاتی ہے، اس کے برعکس روزانہ پُرامن زندگی کے دوران میں یہ قوم نہایت بااخلاق اور شیریں مزاج ہے۔ ہندو تو صرف ہاتھ جوڑتے ہیں، یہ قوم سلام کے لیے آدھی جھک جاتی ہے اور اس وقت تک جھکی رہتی ہے جب تک آپ اپنی کمر سیدھی نہ کرلیں۔ مجھے اکثر سڑکوں پر دو عدد کمریں دوہری کھڑی ہوئی ملتی تھیں اور دونو عدد ایک دُوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتی رہتی تھیں کہ پہلے کون سی سیدھی ہو۔ اس لطفِ اخلاق کے باعث میری نحیف کمر کئی دفعہ مجھ سے الگ ہو کر چلتی تھی، ایک دفعہ تو اس نے لاہور کا رُخ کر لیا اور میں نے بمشکل اُس کا رُخ موڑا۔ اس گنجان جزیرے میں جہاں انسان اَچار کی طرح ڈبوں میں بند ہوں اور سب نہایت قریب قریب رہتے ہوں اور تخلیہ اور تنہائی عنقا ہو، وہاں پر ایک دُوسرے کے حقوق کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ٹیلیفون عام پبلک کے لیے جگہ جگہ رکھا ہُوا ہے، میں نے لگا ہُوا اس لیے نہیں کہا کہ ٹیلیفون کے لیے کھوکھے یعنی کیبن نہیں ہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر کھلے پڑے ہُوئے ہیں، لیکن کوئی راہرو دُوسرے کی باتیں سُننے کے لیے نہیں رُکتا۔ سب کو اپنے اپنے کام سے غرض ہے۔ یہ مصروف، کارکن اور محنتی قوم ہے، ٹھہر کر ٹوہ لینے میں وقت ضائع نہیں کرتی ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے اُصول، تحفے کے پارسل بنانے کے اُصول، چائے بنانے کے اصول، خودکشی کے اصول، عشق کرنے کے اصول، ان نفاستوں اور لطیف آداب

دیکھ کر انسان سمجھتا ہے کہ ہم گنوار بھلے۔ ان لوگوں کی خودداری کچھ تاریخی ورثہ میں آئی ہے، کچھ اقتصادی استقامت سے ملی ہے، کسی موقع پر بھی اہلِ حرفت انعام نہیں لیتے۔ نہ ٹیکسی والے نہ ہوٹل کے خادم نہ گھر کی خادمہ۔ یوُرپ میں ہر قدم پہ انعام دینا پڑتا ہے جو بعض اوقات کھانے کے بل اور ہوٹل کے کرائے کے لگ بھگ جا پڑتا ہے۔ لیکن جاپان میں انعام کی گمشدگی نے سیّاحوں کے لیے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔

جاپانی خاندان پرستی میں ہم سے کم نہیں اور خاندان کا بندھن محبت سے زیادہ ادب و آداب، رسوم و رواج کا بندھن ہوتا ہے۔ بڑے، چھوٹے، منجھلے سب کی حدودِ آداب اور حدودِ فرائض بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، لیکن ان خونی رشتوں کے تانوں بانوں میں عورت کے حقوق کا خُون ضرور کیا گیا ہے۔ باہر سوسائٹی میں تو مغربیّت کی ترنگ میں جاپانی مرد اپنی عورت کے ہمراہ چلے گا۔ آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولے گا لیکن جس وقت اپنے گھر کا دروازہ بند کیا، تو لباس کے ساتھ ساتھ تیور بھی بدل لے گا۔ پتلون اُتار کر اور کمونو پہن کر مرد گاؤ تکیے پر دراز ہے اور عورت پاؤں دُھلا رہی ہے اور طرح طرح کی ناز برداریوں میں ہلکان ہُوئی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں تو ستی ساوتری ایک ہوئی ہے، جو باقی ساوتریاں تھیں، وہ ستی ہو گئیں لیکن یہاں خالص ساوتریاں ہیں۔ بقول ایک مشہور انگریز مصنّف کے، جاپانی عورتیں نیک کیوں نہ ہوں ان کو گھر کے دھندوں سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ کسی قسم کی ترغیب میں پڑیں۔ نئی روشنی، جنگ میں شکست اور صنعتی ترقّی نے نئی پَود کے پاؤں اکھیڑ دیے۔ اس کے باوجود عموماً عورتیں، زینتِ خانہ اور فخرِ صاحبِ خانہ ہیں۔

وہاں کے معاشرے میں ایک خلیج بہت عمیق ہے اور وہ ہے قدامت پسند

بزرگوں اور نئی نسل کے درمیان۔ بزرگ، بچّوں کو بربری وحشی کہتے ہیں، بچّے، بزرگوں کو زندہ لاشیں سمجھتے ہیں۔ درمیانی نسل نے جو کچھ بزرگوں سے سیکھا، ایکدم بھلانا پڑا۔ سیکھا کچھ تھا، سکھانا کچھ پڑا۔ جنگ کے بھونچال اور اس کے بعد اقتصادی بحالی نے ان کی اقدار کو اتنا ہلا دیا کہ نوجوانوں نے پرانے آئین اور بندشیں توڑ دیں لیکن ان کی جگہ نئے اصول اخلاق نہ تراش سکے۔ اب یہ نادان الھڑ "نو آبادی" چوراہے پر کھڑی ہے، کچھ ہراساں کہ کدھر مڑیں، کچھ بے پروا کہ کیا ضرورت ہے آگے بڑھنے یا اِدھر اُدھر راستہ ڈھونڈنے میں تو کوشش محنت اور وقت چاہیے، وہیں کھڑے کھڑے کیوں نہ (TWIST) خم کھایا کرو۔ یہ ٹڈی دل جو آہستہ آہستہ ہر معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے، ٹوکیو کی رگِ زندگی میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ آوارہ لونڈے رنگین قمیصوں اور تنگ پتلونوں میں کولہے مٹکاتے سیٹیاں بجاتے پھر رہے ہیں۔ ان کو وہاں ٹیڈی نہیں کہتے "تایازوکو" پکارتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں "طفلانِ آفتاب" یہ لقب جاپان کے ایک مشہور ناول سے لیا گیا ہے۔ یہ سورج کی اولاد قتل اور چوری تو کم ہی کرتی ہے، البتّہ شور اور دنگے فساد میں پیش پیش ہے۔ اصل میں ان بچاروں کو دُوسرے ملکوں کے ٹیڈیوں کی طرح بغاوت کرنے کا شوق تو بہت ہے، لیکن کس مقصد کے لیے کریں، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ کس جھنڈے کے نیچے جمع ہوں، وہ جھنڈا نظر نہیں آتا۔ بے چین اور بے تاب ہیں کہ جوانی کی بدمست طاقت کو کس کھونٹے سے باندھا جائے۔ اس نسل کو ایک کھلونا مل گیا ہے اور وہ ہے "جنسیت" جنگ کے بعد سے کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اور درمیانی طبقہ کے نابالغوں نے جنسی آزادی منانی شروع کر دی ہے۔ یہ سیلِ رواں کہاں جا کر رُکے گا، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ہم پاکستان میں

بیٹھ کر اپنی لڑکیوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا صنعتی ترقی کے پہیئے تیز ہوئے اور شہروں کی آبادی بڑھی اور کوئی جنگ لڑنی پڑی ، تو یہی مسئلہ ہمیں درپیش ہوگا۔ مجھے بتایا گیا کہ عام طور پر جاپانی جنسی ہیجان کو شیطنت سے منسوب نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں جسمانی خواہشات اتنی ہی جائز ہیں جتنی کہ رُوحانی۔ ایک اوسط جاپانی کا معیارِ اخلاقِ جنسی اتنا ہی گرا ہُوا ہے جتنا کہ ایک اوسط یوروپین کا۔ لیکن کم سے کم جاپانی بگلا بھگت نہیں بنتے۔ وہ صاف اور روزِ روشن میں اعلان کرتے ہیں کہ جنسی رشتہ پُر لطف تو ہوتا ہے، لیکن یہ زندگی کا اتنا اہم جزو نہیں، جتنا یورپ میں سمجھا جاتا ہے، اس جنسی شغل کو دیگر معاملات پر ترجیح دینا غلط ہے۔ یہ شغل اتنا ہی قابلِ مذمت ہے، جتنا کہ سگرٹ، تمباکو پینا ہے۔ پرانے زمانہ میں لفظِ جنس زبان پر لانا سوسائٹی میں باعثِ شرم تھا، حالانکہ پردے کے پیچھے سب کچھ روا تھا۔ آجکل کے نوجوان نہ صرف اسے عمل میں لاتے ہیں، بلکہ گفتگو میں بھی شامل کر لیتے ہیں۔ بات چھڑی اور بزرگ چونکے! اور بزرگوں کو چونکانے میں بچّوں کو بہت مزہ آتا ہے، ایک امریکی مصنفہ لکھتی ہے کہ جاپان میں تخیلِ گناہ سرے سے غائب ہے عموماً لوگ نیک و بد کے زُمروں میں نہیں ڈالے جاتے، بلکہ کمزور اور مضبوط کہلاتے ہیں۔ اچھّے یا بُرے کو بدرُو یا خوب رُو کہتے ہیں، حالاتِ زندگی میں نیکی بدی کو فراخی یا تنگی ترشی یا شیرینی پکارتے ہیں۔ ایک چیز وہ خوب سمجھتے ہیں اور وہ ہے مُنہ کا کالا ہونا۔ گناہ کیا ہے، عذاب ثواب کیا ہے، یہ سب کچھ طاقِ نسیاں میں رکھ دو، لیکن سماج کے سامنے مُنہ کالا نہ ہو۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، انہیں ایک ہی فکر کھائے جاتا ہے کہ گھر والوں کے آگے شرم رہ جائے۔ محلّہ والوں کے آگے ناک رہ جائے۔ قوم کے آگے عزّت رہ جائے، اگر کسی مرحلہ پر

ذرا بھی زک اُٹھانی پڑی اور شرمندگی ہوئی تو دین دُنیا اندھیر، پھر جاپانی فوراً خودکُشی کا انتظام کرے گا، پچھلی جنگ کی شکست میں ساری قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا تھا، اسی لیے ہزاروں نے "ہراکری" کرلی یعنی خنجر سے اپنی جان لے لی۔

خودکُشی اپنے نام پر سے دھبّہ مٹانے کا بہترین طریقہ ہے، سب گناہ کر کے خودکُشی کرلو، تو سماج سب گناہ معاف کردے گی۔ ناک قائم رہنی چاہیے۔ جان بے شک چلی جائے۔ زندگی تو شاید دوبارہ بھی مل جائے، پتہ نہیں وہاں ناک ملے نہ ملے۔

یہاں ۱۹۵۷ء میں تپدق کی اموات سے دُگنی اموات خودکُشی سے ہوئی تھیں، اب اس کا شمار بڑھتا جارہا ہے۔ ویسے دُنیا میں سب سے زیادہ خودکُشیاں سویڈن میں ہوتی ہیں اور اس کے بعد جاپان میں، جاپانی شاید افسوس کرتے ہوں کہ خودکُشی میں بھی یورپ کو ہرانا چاہیے تھا۔ اور کیا عجب ہے کہ شاید اس معاملہ میں بھی وہ بہت جلد ریکارڈ قائم کردیں، ویسے جان دینا وہاں بائیں ہاتھ کا کام ہے، ذرا ذراسی بات پر لوگ پہاڑیوں سے چھلانگ لگا دیتے ہیں، عاشق اور معشوق خودکُشی کا معاہدہ کر کے ایک دُوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر ابدی نیند سو جاتے ہیں۔

ایک امریکی مصنف نے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اس قوم کے کریکٹر کا بہت عمیق تجزیہ کیا ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ ساری دُنیا کی قوموں میں اگر کسی قوم کو سمجھنا مشکل ہے تو وہ جاپانی ہے۔ مشرق کا سب سے مشکل معمّہ ان کا قومی کریکٹر ہے اور اس کی وجہ ان کی سیرت کا باطنی تضاد ہے؛ چنانچہ ہر خصوصیت کے دو متضاد رُخ بیک وقت اس قوم میں موجود ہیں۔ جاپانی ایک طرف شہنشاہیت پرست ہیں، دوسری طرف جمہوریت پرست۔ اور جس قدر سائنٹفک تہذیب اور سائنس کے پروانے ہیں، اسی قدر فنونِ لطیفہ کے دلدادہ،

مادیت، اور دنیاوی لذّت کے خواہاں۔ اس کے باوجود سکون پرست اور تصوّف پسند، مشرقی تہذیب کے علم بردار اور مغربیت میں رچے ہوئے، جنگ جوئی اور امن جوئی میں بیک وقت مصروف۔ دورانِ امن میں ان سے زیادہ کوئی مہذّب نہیں۔ دورانِ جنگ میں ان سے زیادہ کوئی خونی درندہ نہیں، بغاوت اور قدامت پسندی رگ اور ریشے میں ساتھ ساتھ موجود ہے۔ طبیعت میں سکون اور ہیجان قریب قریب یکساں ہے، یہی لوگ امن اور سکون کے ساتھ گھنٹوں چائے پیتے جاتے ہیں اور سورج کو آہستہ آہستہ غروب ہوتے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، اور یہی لوگ دو منٹ میں لال پیلے ہو کر مرنے مارنے پر تیّار۔ موت پر انہیں ہنسی آتی ہے اور جسمانی اذیت اور کرب کے لیے ان کے پاس حقارت کے سوا کچھ نہیں۔ تکلیفات اور مشکلات کو ہیچ سمجھتے ہیں اور موت کی پروا نہیں کرتے اور برعکس اس کے زندگی سے بھی عشق ہے۔ اس کی رنگینیوں میں دن رات محو بھی ہیں، کئی باتوں میں سست ہیں اور کئی باتوں میں کام کے دیوانے۔ اتنی ذہین و زکی قوم جس نے ایشیا میں اپنی ترقّی سے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ انفرادی طور پر اس قدر غبی اور کند ہے کہ رونا آتا ہے۔ گھنٹوں اگر مغز مارو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا کہ مخاطب ہماری بات سمجھا کہ نہیں۔ اور یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ وہ جو اتنی لمبی بات کر رہا تھا خود بھی سمجھ رہا تھا یا نہیں، نہ زبان سمجھیں نہ ہاتھ کے اشارے سمجھیں۔ کوئی نکتہ سمجھانے کے لیے بال سفید ہو جاتے ہیں، لیکن وہ نکتہ جاپانی کھوپڑی کے باہر ہی بھٹکتا پھرتا ہے، یہ قوم سائنس اور مغربیت کے باعث تنظیم، تربیت اور سلیقے و قاعدے کی بہت قائل ہے، اس کے باوجود میونسپل کارپوریشن میں اندھیر گردی مچی ہوئی ہے، عمدہ بسیں اور ٹرک بناتے ہیں لیکن

بہت سی سڑکیں ابھی تک پچھلی صدی کی آئینہ دار ہیں۔ ٹوکیو کی دو تین بڑی سڑکوں کے علاوہ سب سڑکیں چھوٹی تنگ اور ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سوائے دو چار مشہور سڑکوں کے کسی سڑک کا نام نہیں۔ گھروں کے نمبر یا تو ہیں ہی نہیں یا ہیں تو چار گھروں کے ایک ہی نمبر۔ میرے خیال میں جاپان کا سب سے بڑا سُورما اُس کا ڈاکیہ ہے جو کفن کی طرح خط کا تھیلا سر پر ڈال کر نکلتا ہے، اور یہ جانے بغیر کہ سڑک کونسی ہے اور نمبر کیا ہے۔ سالہا سال کی مشق کے بَل بوتے پر، وہ مکتوب الیہ کو خط دے دیتا ہے، لیکن نئے رنگروٹ کے اعصاب تو کئی بار کام کرنے سے جواب دے دیتے ہیں۔

ایک اور عجوبہ یہ ہے کہ عموماً لوگ یہاں ہر بات پر مُسکرا دیتے ہیں، لیکن ان کی مُسکراہٹ صرف ہنسی یا خوشی کے موقع پر ہی نہیں ہوتی، جب ہماری بات نہیں سمجھتے تو مُسکراہٹ، جب کھسیانے ہو جاتے ہیں تو مسکراہٹ، جب خودکشی کے لیے تیّار ہوتے ہیں تو مسکراہٹ، ایسی مُسکراتی ہُوئی قوم سے اُمّید کی جاتی ہے کہ بذلہ سنج اور بامذاق ہو گی، لیکن نہیں، وہ ہر بات کو نہایت سنجیدہ انداز سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ رات کو گیشا خانے میں ناچ گانا بھی غور سے سُنتے اور دیکھتے ہیں۔

ایک انگریز مزاح نگار لکھتا ہے کہ میں رات کو ایک شبینہ کلب کی رنگین محفل میں بیٹھا تھا، پریاں نیم برہنہ رقص کر رہی تھیں۔ میں نے مُسکراتے مُسکراتے اپنی سرشار نظریں دو جاپانی مردوں پر ڈالیں، تو وہ عینکیں لگائے بہت غور و خوض سے برہنہ ناچ کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک تو کچھ نوٹ بھی لکھتا جا رہا تھا۔ میں

یہ منظر دیکھ کر کانپ گیا، میرا دم گھٹتا، یہ کلب ہے یا تجزیہ گاہ!
باہر نکل کر میں نے اپنے جاپانی دوست سے کہا:
"تمہاری قوم میں ایک چیز کی سخت کمی ہے اور وہ ہے بامذاقی، حسِ ظریفانہ۔"
تو اُس دوست نے فوراً اپنی چھوٹی سی نوٹ بُک نکال کر لکھا۔ "ورزش بذلہ سنجی، صُبح آٹھ بجے۔"

موسكو

موسکو! کچھ اس نام ہی سے سیاسی سنسنی اور جسمانی تھرتھری شروع ہو جاتی ہے، خدا سلامت رکھے مغربی نامہ نگاروں کو جنھوں نے رُوس کو آہنی پردہ سے تشبیہہ دے کر بے چین سیّاحوں کے ولولوں پر برف ڈال دی۔ یکطرفہ کہانی سُن سُن کر میرا بھی دل کبھی نہ اُبھرا، پھر میرے دماغ میں کیڑا کیوں کلبلایا، اور میرا تلوا کیوں کھُجلایا، نہ میں منگل کی پیدائش، نہ خاندان میں کسی طرف سے گیدڑ پن آیا، کہ میں اس شہرِ "روسیاہ" کا رُخ کرتی۔ پھر کیوں اور کیسے؟

لندن میں ایک ایسا عجیب کورس ہے، جس میں شوہر کا تو کالج میں داخلہ ہو جاتا ہے اور بیوی کی چھٹیاں شروع ہو جاتی ہیں، بچّوں کی مرضی، اسکول جائیں نہ جائیں، کبھی چلے بھی جاتے تھے، میں اور میری دو چھوٹی وفادار آفتیں جن کو میں کسی پچھلے مضمون میں بلا ارادہ "فرشتے" لکھ گئی ہوں۔ خوب سیریں کر کر کے ہانپ گئے تھے، اور واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ لندن کے بازار بدستور بھرپور اور ہماری جیبیں خالی، کہ موسکو سے ہمارے عزیز دوست آغا ہلالی کا جو اُس وقت وہاں ہمارے سفیر لگے ہوئے تھے، پُرزور دعوت نامہ آیا کہ بھئی واپسی پہ ذرا یہاں

IMPERIAL DEFENCE COLLEGE

سے ہوتے جاؤ۔ یہ بھی خوب رہی گویا موسکو بھی گھنٹہ گھر ہے کہ یہاں سے ہوتے جاؤ۔ دُنیا آخر کہاں تک سِمٹے گی، خیر خیال بُرا نہیں تھا اور دعوت سے انکار کرنا سنّت کے خلاف ہے۔ پھر اسی واپسی کے ٹکٹ میں موسکو بھی شامل ہو سکتا تھا، اور ہم کو فالتو پیسے بھی نہ بھرنے پڑتے۔ بجائے لندن سے سیدھے کراچی جانے کے ہم فرانس اور پولینڈ سے ہوتے ہُوئے موسکو اور وہاں سے سیدھے دہلی پہنچ سکتے تھے۔ اور دہلی سے لاہور تو پلک جھپکنے کی اُڑان ہے۔ یعنی ایک ٹکٹ میں کئی مزے، کسی دوست نے یہ بھی صلاح دی کہ موسکو ریل سے جاؤ، کُل چار دن کا سفر ہوگا اور راستے بھر یورپ اور رُوس کے دیہات دو طرفہ دیکھتی جانا۔ میں تو راضی ہو گئی، لیکن بچّوں نے بغاوت کر دی کہ اتنا لمبا سفر شیطان کی آنت ہو جائے گا۔ کچھ رُوسی سفارت خانے نے بھی میخ نکالی۔ میں نے کہا: "لو بچو! آج تمہاری بات مانی گئی، سُرخ سَرحد کے پار میری مانی جائے گی۔"

رُوس کی تیّاری کیا تھی، نپولین کی ایک مہم کی تیّاری تھی۔ تاریخ نے کچھ دُھندلی دُھندلی یاد دہانی کی کہ نپولین کی شکست کا باعث وہاں کی باد و برف تھی اور ہم عین سردیوں کے شباب میں جا رہے تھے۔ اپنے آپ کو کیل کانٹے سے لیس کرنا شروع کیا۔ سوٹ کیس گرم لبادوں سے پھول رہا تھا، اور میرا سانس اس کو کس کس کے۔ لیکن موسکو کو دسمبر ہی میں دیکھنا چاہیے، برف ہی برف۔ برف سڑکوں پر، درختوں پر، مکانوں پر، ہوائیں، فضائیں۔ یہ خون کو سُرخ آئس کریم بنا دینے والا موسم موسکو کے تاریخی شہر کے لیے صحیح پس منظر ہے۔ اس سے رُوس کے قومی کیریکٹر، قومی مسائل اور تاریخی واقعات کی ذرا ذرا توضیح میسّر ہوتی ہے۔

خیر لندن میں کچھ ہمارے دوست خوشی سے اُچھل رہے تھے، گویا کہ خروشیف سے سمدھیانہ جوڑا جا رہا ہے۔ کچھ ذرا جز بز اور ترشا کی تھے کہ تم دُشمنوں کے مُلک میں سیر کے لیے کیوں جا رہی ہو۔ ایک دو نے مُجھ کو دھیمی دھیمی دھمکیاں بھی دیں کہ سارے وقت تمہارے پیچھے جاسوس لگے رہیں گے۔ میں نے کہا عورت کو تعاقب بہت پسند ہے۔ وہ بھی جب اور لوگ اس کا کریں۔ دوسرے بولے وہاں اتنی ظالم سردی پڑتی ہے کہ ناک کان جھڑ جاتے ہیں۔ میں بولی میری ناک اتنی لمبی ہے کہ ذرا سی اگر جھڑ گئی، تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ کوئی قلوپطرہ کی ناک تو ہے نہیں، جس کی کمی بیشی سے تاریخ اپنا رُخ بدل دے۔ تیسرے بولے وہاں دیکھوگی کیا؟ جو کچھ دیکھنا چاہوگی وہ دکھائیں گے نہیں، صرف اپنے سیاسی مذہب کی تسبیح پڑھ پڑھ کر تم پر پھونکیں گے۔ تمہارے ذہن کو اشتراکی پرچار میں ڈبو ڈبو کر بالکل صاف کر دیں گے۔ میں نے کہا اس کا بھی کوئی ڈر نہیں۔ اوّل تو میرا دماغ ایک چھلنی کی طرح ہے، جو پرچاری گنگا جل ڈلا فوراً باہر نکل جائے گا۔ دوسرے میں موسکو ایک وہمی شکی نقاد کی حیثیت سے نہیں جا رہی، جو وہاں کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی خامیوں کو ڈھونڈ کر نازاں ہو۔ میں ایک آزاد منش جولاں سیّاح کی طرح صرف سیر کی غرض سے جا رہی ہوں۔ میرا ذہن تعصّبات سے پاک ہے مجھے صرف وہاں کے معاشرے اور ثقافتی زندگی کو دیکھنے کا شوق ہے۔ بین الاقوامی سیاست کو پڑھ پڑھ کر اور "جنگِ سرد" کی سرگرمیاں سُن سُن کر میرا خون اتنا پتلا ہو گیا ہے کہ کسی ازم کا نام آیا اور مجھے پتّی اچھل آتی ہے۔ مجھے ان کے آہنی پردے کے پیچھے جھانکنے کی نہ تمنّا ہے اور نہ تاب۔

الغرض میں نے دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر لندن اور اپنے میاں کو الوداع

کہا اور ہم فرانسیسی کومیٹ میں پیٹیاں کس کر بیٹھ گئے۔ لندن چھوڑنے کا شدید قلق تھا اس کے ایّامِ رفتہ انتہائی حسین یادوں سے معطّر تھے۔ دو چار آنسو بے حجاب، بے نقاب ہو گئے۔ میری بیٹیاں اس جذباتی حماقت پر ہنس دیں، کومیٹ بغیر زمین پر دوڑے ناک کی سیدھ میں شوں سے اُٹھا اور چند لمحوں میں شوں سے پیرس پر اُتر گیا۔ اتنا مختصر ہوائی سفر میں نے کبھی نہیں کیا۔ پیرس کی زیارت میں پہلے بخوبی کر چکی تھی اب کے اپنی اولاد کو بصد شوق سیریں کرانے لائی تھی، تین دن میں اُنہوں نے مجھے وہ ناکوں چنے چبوائے کہ میں نے کان پکڑے کہ آئندہ اس شہرِ سحر انگیز میں ان جنگلی کبوتریوں کو کبھی نہ لاؤں گی۔ جس بے دلی اور بے اعتنائی سے اُنہوں نے لوور، وارسائی، نوتروام اور مومارت کو نظر سے گزارا، وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ شانزالیزے پر یہ پیٹ بون کا فلم دیکھنے گئیں جب آئیفل ٹاور پر چڑھ کر اُنہوں نے لندن اسکول کی اُستانیوں کو پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا، تو میں چھلانگ لگاتے لگاتے رہ گئی۔ خیر یہ جگر سوز داستان پھر کبھی سہی۔

تین دن کی خاک چھاننے کے بعد ہم نے پھر ایئر فرانس کا کیراویل جیٹ پکڑا اور ڈھائی گھنٹے میں پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں جا پہنچے۔ وہاں بیٹھ کر کمر سیدھی کی۔ گرم گرم کافی پی اور پھر اُسی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کمر کس لی۔ ڈھائی گھنٹے کے اندر جہاز موسکو پر منڈلانے لگا۔ بادل اور دُھند کی وجہ سے شہر کی بجلیاں دکھائی نہ دیں۔ ویسے بھی رات کو موسکو چنداں روشن نہیں۔ رات کے وقت روم یا ہانگ کانگ اُترو تو یوں لگتا ہے کہ ہمارا اُڑن کھٹولا تاروں کی راجدھانی میں جشن منانے اُتر رہا ہے۔ جہاز اُترا تو اندر دو رُوسی آفیسر گھس آئے۔ ویزا اور پاسپورٹ جمع کر لیے۔ ایک نے میرا نام جما جما کر اس قدر شین قاف کے ساتھ لیا کہ میں چونک گئی "اخ۔ تر۔ ریاض۔ الدین۔ اح۔ مد" کبھی مجھے

گمان بھی نہ گزرا تھا کہ میرا نام اتنا گاڑھا ہو سکتا ہے، اکثر یورپ کے شہروں میں تو مجھے "ایکٹر" پکارتے تھے۔

رُوس کے فولادی پن کی دھاک تو ہوائی اڈے پر ہی بیٹھ گئی تھی، میرے چار وزنی ٹرنک جنہیں پچھلے شہروں میں دو مزدور اُٹھاتے یا پھر ٹرالی پر لاد دیے جاتے تھے، یہ چاروں لبالب صندوق ایک رُوسی قُلی نے جو بظاہر اوسط قد اور چور جسم کا تھا۔ اس طرح اُٹھا لیے کہ میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ دو بغل میں، دو ہاتھ میں اور یہ جا، وہ جا۔ صدیوں کے برفانی اور سیاسی طوفان و مصائب برداشت کر کر کے یہ قوم ٹھوس ہو گئی ہے۔ ان بازوؤں میں خون منجمد ہو کے لوہا بن گیا ہے۔ ایک حیرت کی بات یہ بھی دیکھی کہ پاسپورٹ دیکھنے میں رُوسی افسروں نے دیر نہیں لگائی اور میرا سامان نہ کھولا، نہ چُھوا۔ یورپ کے کئی شہروں میں سامان کھولنا پڑتا ہے۔ ایشیا میں تو کئی جگہ پُوری جانچ پڑتال ہوتی ہے، لیکن یہاں پر کسٹم کے منکر نکیروں نے کوئی سوال جواب نہیں کیے۔ رُوسی جب ایک دفعہ فیصلہ کر لیں کہ کسی معاملے میں ڈھیل دینی ہے تو پُوری ڈھیل دیتے ہیں۔

ہوائی اڈّا شہر سے بہت دُور تھا اور سارے راستے برف کی بلوری تنہائیاں اور صنوبر کی برہنہ پرچھائیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پاکستانی سفارت خانہ اور ہلالی صاحب کا گھر ایک ہی شاندار اور وسیع عمارت میں تھا۔ دروازے کے دونوں طرف لحیم شحیم مسکوئی محافظ جو فرغل میں ملبوس ساکت اور جامد کھڑے تھے، پُھرتی سے سلامی دے کر پھر سکوت میں چلے گئے۔ میں نے اپنی دوست سے ہنس کر پُوچھا، یہ عزّت افزائی ہے یا نظر بندی! جواب ملا جو بھی سمجھ لو۔ یہ دو سلولائیڈ کے گُڈے ہم کو

مفت عنایت ہُوئے ہیں، اور کڑی سے کڑی سردی میں اسی طرح چوبیس گھنٹے ستون بنے کھڑے رہتے ہیں۔ ان کا کام غالباً ہم پر خاموش نظر رکھنا ——— اور آتی جاتی کار کے نمبر نوٹ کرنا ہے۔ یہ دونوں مسکین شادی شدہ ہیں۔ جب تک ہمارے سیاسی تعلقات کا چارہ ہو، یہ تو برہم چاری ہو گئے۔ میرا تعارف ان کی سوشل سیکرٹری زویا سے کرایا گیا، جو ایک ۲۵ سالہ مدبّر اور ذہین شخصیت تھی، انگریزی اور اُردو بخوبی بول لیتی تھی اور تکیہ کلام تھا "زندگی۔ کیا کروں"۔ اس مخصوص رُوسی لہجے میں مجھ سے بہت گھُل مِل گئی اور موسکو میں میرے لیے بہت عُمدہ رہبر ثابت ہوئی۔ حالات کے مدّوجزر اور جنگ عظیم کی گرانبار سختیوں نے اِسے ایک حلیم فلسفی بنا دیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے یکدم اس قدر لاینحل مسائل پر لاجواب سوال کرتی تھی کہ میں چکرا بھی جاتی تھی اور مُباحثے سے لُطف اندوز بھی ہوتی تھی۔

دُوسری ہستی نیلی (NELLY) تھیں جو دفتر میں ہر قِسم کا کام انجام دیتی تھیں، یہ کوہِ قاف کے جوان پَری رُخ باشندوں میں سے تھی اور پھُرتی اور تُندی میں ہر ایک سے بھِڑ جاتی تھی۔ اکثر ہنگامہ خیز موقعوں پر میں نیلی کو ساتھ رکھتی تھی، کیونکہ وہ ہجوم کو چیرتی، اِدھر اُدھر صلواتیں سناتی اور ہمارے لیے راستہ بناتی چلی جاتی تھی اور غریب کا آدھا وقت چاروں طرف گھُورتے ہُوئے مردوں کو گھُرکنے، ڈانٹنے، ڈپٹنے میں گزر جاتا تھا۔

بیگم ہلالی کے بیٹے کی رُوسی گورنس ایک سَتّر سالہ فربہ اندام خنداں بہ لب شفیق بزرگ تھیں، جنھوں نے مجھے وفورِ شوق سے اس زور سے چمٹایا کہ میرا سانس گھُٹ گیا اور مُنہ نیلا ہو گیا، یہ دیکھ کر بیگم ہلالی نے مجھے ان کی آغوشِ التفات سے چھُڑایا۔ رُوسی اوّل تو ملتے ہی نہیں، اور اگر ملتے ہیں تو ایسی گرم جوشی سے ملتے ہیں کہ ہڈیاں چٹخنے لگتی ہیں۔ مشفق گورنس کا مختصر نام "ماری انتو نا ونا" تھا، جو بیگم ہلالی کی والدہ کو یاد نہیں رہتا تھا۔

وہ اُسے اکثر "مریم ٹونا" ہی پکارتیں تھیں۔ نانیوں دادیوں کو رُوسی زبان میں "بابُشکا" کہتے ہیں اور اس پر یہ لفظ بہت سجتا ہے۔ عموُماً کام کرنے والی عورتوں کی طرح سیاہ لباس اور کسے ہُوئے بالوں کا جوُڑا اور زبان پر "خروشے، خروشے" جس سے وہ ہر ایک کا خیر مقدم کرتی تھیں، میری یورپ کی خرید و فروخت دیکھ کر اتنی ششدر ہوگئیں کہ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ اِن کا دل بند ہو میں صندوق بند کرلوں۔ ان عورتوں نے یہ عیش کے لوازم خواب میں بھی نہیں دیکھے۔ وہ بچّوں کی اطالوی گڑیا پر فدا فدا تھیں۔ آتے جاتے اُسے سینے سے لگا کر اتنی چُوما چاٹی کرتی تھیں کہ کُچھ عرصہ کے بعد میری بیٹیوں نے گڑیا الگ سَرکا کر رکھ دی کہ اس میں سے "مریم ٹونا" کی مہک آ رہی تھی۔

رات کو ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ صُبح نو بجے آنکھ کھُلی تو ایک ضعیف و ناتواں سُورج کپکپاتے، لڑکھڑاتے، ہانپتے کانپتے، آہستہ آہستہ کمرے میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کُچھ دیر میں اس کی پیلی زرد دھوپ نڈھال ہو کر برف پر گر پڑی۔ ہم ناشتہ کر کے تیار ہُوئے۔ آج صبح ہم صرف کار میں شہر کا جائزہ لیں گے۔ دہلیز پر کھڑے ہو کر باہر جھانکا۔ ذرا سا دروازہ کھولا۔ گردن نکالی ہوا تیز تھی، لیکن پھر بھی اتنی سَرد نہیں جتنا ڈرایا گیا تھا، مفلر لپیٹ کر کار میں بیٹھے تو وہ بھی گرم، کیا مذاق ہے۔ ارے ہم موسکو ہوا کھانے آئے ہیں، ٹھنڈی ہوا۔ گھر جا کر کیا رُعب جمائیں گے کہ کتنی سَردی کھائی۔ "گگارن، شیشے نیچے کرو، اور ہیٹر بند کرو۔" ہمارا مہذّب رُوسی ڈرائیور گگارن حکم عدولی نہیں جانتا تھا۔ شیشے نیچے ہو گئے، کُچھ دیر تو لمبے لمبے سانس لے کر ہم سب بہت خوش ہُوئے۔ جب سانس جمنے لگا، تو شیشے پھر اُوپر ہو گئے۔ ہم نے چاروں

طرف نظر دوڑائی۔ سفید برّاق برفوں پر سیاہ لبادے جُھکے ہُوئے سڑکیں صاف کر رہے تھے۔ موسکو کی خاک روبی بلکہ برف روبی انھی عمر رسیدہ بوڑھیوں کے سپُرد ہے جن کو جھاڑو بہارو کے لیے کمر جھکانی نہیں پڑتی کہ پہلے ہی سے جُھکی ہوئی ہے۔ دُوسری چیز جو نمایاں طور پر نظر آئی، بلکہ سنائی دی، وہ تھی خاموشی۔ ٹریفک اوّل تو مقابلتاً اور مُلکوں سے کم تھا اور جو تھا بھی وہ شور نہیں مچاتا تھا۔ مجھے شاذونادر ہی ہارن سنائی دیا۔ غالباً سڑکوں کی وسعتیں اور برف کی تہیں شور کو جذب کر لیتی تھیں۔ چند سڑکیں اتنی کشادہ تھیں کہ ایک وقت میں دس دس کاریں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں۔ ٹریفک کے اصُول اور قواعد اتنے مشکل ہیں کہ سُنا ہے انہیں سیکھنے میں خاصا عرصہ لگتا ہے، ویسے بھی کار چلانے کا معیار اتنا بلند ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس لینا جُوئے شیر لانا ہے۔ کئی امریکن اور انگریز ابتدائی امتحانوں میں فیل ہو جاتے ہیں۔ ان کا گلہ یہ ہے کہ یہ سب رُوسیوں کی ادنیٰ کارستانی ہے کہ جان جان کر مشکلات پیدا کرتے ہیں تاکہ ہم لوگ مفلوج و بے کار ہو جائیں۔ واللہ اُعلم۔

سرسری نظر میں شہر عموماً اُداس، ماند اور مدّھم معلوم ہُوا۔ کُچھ موسمی سختی، کچھ سیاسی ضبط، کچھ جذباتی بے حسی، نہ رنگین راہرو نہ خوش باش چہرے، نہ جوانوں کے قہقہے، نہ منچلوں کے آوازے، عمارتیں عموماً بوسیدہ اور پُرانی طرز کی تھیں۔ صرف معدُودے چند عمارتیں جدید اور فلک بوس تھیں۔ رات کو ان پر لال ستارے غمزہ زن ہیں۔

موسکو کی سڑکیں اس لیے پھیکی اور بے رنگ معلوم ہُوئیں کہ دُکانوں کی سجاوٹ معدوم، اور ——— اس لیے معدوم کہ دکانیں سرکاری ہیں۔ انفرادی اور ذاتی مقابلہ نہ ہونے کی وجہ سے دکانوں کی زیبائش پر کوئی پُونجی صرف نہیں کرتا۔ دُوسری

وجہ سڑکوں کی بے رونقی کی یہ تھی کہ اشتہارات سرے سے غائب تھے ہیں نے سارے قیام میں صرف دو اشتہار دیکھے - ایک تھا "دودھ زیادہ پیو، صحت بناؤ"۔ دُوسرا تھا "فضول خرچی اپنے آپ پر اور حکومت پر ظلم ہے"۔ اب امریکہ اور یورپ کے شہروں میں سے اگر اشتہار اُتار لیے جائیں، تو وہ سب بیسویں صدی کا سوگوار مدفن معلوم ہوں۔

اشتہاربازی اِن مُلکوں میں فن کی زد سے نکل کر سائنس بن گئی ہے، عوام کو دلکش رنگوں، منوّر قمقموں اور رجال شناسی کی رشوتوں سے رام کیا جاتا ہے، لیکن رُوسی نظریہ اس قسم کے اشتہارات کو عوام کے ساتھ جعل سازی قرار دیتا ہے۔ خروشیف کا کہنا ہے کہ اشتہارات سرمایہ داری کی سب سے مہلک بیماری ہیں۔ جس نے جمہُوری عوام کی قوّتِ امتیاز سلب کر لی ہے اور عوام وہی چیز خریدنے لگتے ہیں جس کا ہر رُوز اخبار، بازار یا ٹیلی ویژن پر بار بار اشتہار دیکھتے ہیں۔ بہرحال فلسفہ ایک طرف، موسکو کے بازار اور دُکانیں بالکل بنارس گھاٹ پر سر مُنڈی ہندو بیوائیں نظر آئیں۔ ایک اور تازیانہ یہ کہ دُکانوں کے نام نہیں ہیں، صرف نمبر سے یاد رکھی جاتی ہیں۔ اس بے نامی، گُم نامی سے بھی رونق میں فرق آجاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ لاہور کی دُکانوں پر سے نام کے بورڈ اور تختیاں ہٹالی جائیں، کریم بخش کو کہیں نمبر ۲۵، اور شیخ عنایت اللہ کو کہیں نمبر ۴۱، اور فضل دین کو ۴۲۴، تو کیا بدمزگی ہوگی۔ ناموں سے دُنیا میں زندگی ہے، رنگ و روغن ہے۔

لیکن خیر ان سب باتوں کے باوجود سارے وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم کسی انوکھے مُلک میں آگئے، اس کی ہَوا، اس کی فضا، اس کی چال ڈھال، رنگ روپ ایک علیحدہ دُنیا معلوم ہوتی ہے، جو یورپ کی دُنیا سے خاصی جُدا ہے۔ اور یہی اختلاف

اس کی سب سے بڑی کشش ہے۔ رُوس آدھا یورپ، آدھا ایشیا۔ اس کا جغرافیہ ایک طرف یورپ سے ہمکنار ہے، دُوسری طرف ایشیا سے، اس کے معاشرے نے بھی دوطرفہ اثرات جذب کیے ہیں، بقول پنڈت نہرو کے "اس کے کونے کونے سے ایشیا جھانک رہا ہے، حالانکہ موسکو مقابلتاً جنوبی رُوس کے، زیادہ تر یورپی ہے۔ لیکن اس میں اکثر جنوبی ایشیائی باشندے نظر آجاتے ہیں۔ سیّاحوں کی تعداد بھی زیادہ تر ایشیائی یا مشرقی یورپ سے ہے۔ طرح طرح کے قومی اور صُوبائی لباس دکھائی دیتے ہیں۔ میری ساڑھی نیپلز اور نیس میں ایک عجوبہ سمجھی جاتی تھی، لیکن یہی ساڑھی موسکو میں تسلیم شدہ لباس تھا۔ یہاں کی زبان کانوں کو اجنبی نہیں لگی۔ خ اور ژ کے استعمال حروف سے کُچھ کُچھ مانوس آوازیں سنائی دیتی تھیں، رُوسی زبان کا "گری لِک" رَسم الخط، لاطینی رَسم الخط سے بہت جُدا ہے، انگریز مضحکہ اُڑاتے ہُوئے کہتے ہیں کہ رُوسیوں نے ضِد میں اپنے حروف کو بھی اُلٹا دیا۔ جو ایک زبان میں "P" ہے، تو دُوسری زبان میں "R" ہے رُوسی "B" انگریزی "V" ہے، جو یہاں "T" ہے، وہاں "G" ہے۔ ہم اُلٹے بات اُلٹی، یار اُلٹا"۔ تمام سیّاحوں کی طرح ہم نے بھی چند لفظ سیکھ لیے، مثلاً سپاسیبا معنی شکریہ۔ "پواچے موں" کیوں؟ پرالستا بمعنی مہربانی ہے۔ نیت = نہیں۔ خراشو = بہت اچھا بہت خوب۔ "ڈاہ" ہاں۔ "دسوادانیا" = خداحافظ، یہ لفظ تو پھر بھی بہت تھے۔ میرے میاں نے تو صرف تین الفاظ سے پُورا روم فتح کر لیا تھا۔

یہاں کے لوگ سُرخ و سپید قوی ہیکل نظر آئے؛ البتہ اتنے قدآور نہیں، جتنے میرے ڈراؤنے خوابوں میں نظر آئے تھے۔ درمیانہ قد لیکن ٹھوس فولادی جسم، لباس سادہ، چوڑی پتلونیں اور چوڑے چوڑے کوٹ پہن کر اور بھی چوکور نظر آتے ہیں۔ عورتیں

بھی ماشاءاللہ ہی ماشاءاللہ اپنے کوٹوں میں پھٹی پڑتی تھیں۔ اوّل تو رُوسی عورتوں کے پاس کمر پتلی کرنے کے لیے وقت نہیں، اُوپر سے اُن کی سردی نے اُن کے رہے سہے فیشن کو اور فرغل میں پہنا کر رکھ دیا ہے۔

اس پر طرّہ یہ کہ ہاتھی کی جھول، بھاری لبادے، سڑکوں پر معلوم ہوتا ہے کہ پوستین کے پوٹلے لڑھکتے جا رہے ہیں، پھر ان عورتوں کا چہرہ سنگھاری آمیزش سے مبرّا، کوئی عورت سُرخی پاؤڈر لگائے دُور سے ہزاروں میں ایک نظر آتی ہے؛ البتہ اب پچھلے چند سالوں میں نوعمر نسل کو فیشن کا شوق چرانے لگا ہے، باہر کے ملکوں کی خبریں سُن کر اور تصویریں دیکھ کر جوان لڑکیاں بھی آنکھوں کا میک اَپ اور بالوں کی جدید قطع قبول کرنے لگی ہیں۔ حکومت اپنی خاص نمائش گاہوں پر ہوٹلوں میں، ٹیلی ویژن پر، اسٹیج، تھیٹر، سرکس میں لڑکیاں چُنتے وقت ہُنر کے ساتھ حُسن کی شرط رکھتی ہے۔ بلکہ ان کے عمدہ لباس اور اعلیٰ سنگھار کو بھی مدِّ نظر رکھتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جو رُوسی کھلاڑی لڑکیوں کی ٹیم بین الاقوامی کھیلوں میں شریک ہونے رُوم گئی تھی، اتنی خوش شکل اور چھریرے بدن کی تھی اور اس قدر نوک پلک سے درست کہ جس وقت اور قوموں کے ساتھ سلامی کے لیے پریڈ ہوئی، تو امریکنوں نے کہا "یہ رُوسی لڑکیاں ہو نہیں سکتیں۔ ضرور کرائے پر بُرائے نمائش منگائی گئی ہیں۔ اصلی بے ہنگم اور فیل پیکر رُوسنیاں تو اپنے خیموں میں چھپی بیٹھی ہوں گی۔"

سب سے زیادہ سُرخ اور موٹے ان کے بچّے تھے، جس بچّے کو دیکھو لال بلوُن، اُس پر گول گول فرکی ٹوپی اور کنٹوپ پہنے۔ سڑک پر یوں معلوم ہوتے تھے، جیسے غبارے فٹ بال ٹپتے کھا رہے ہوں۔ میں تو کئی جگہ بے ساختہ رُک کر اُن کو پیار کرتی تھی بعض

بچّے اپنی لکڑی کی گاڑیوں "SLEDGES" میں اطمینان سے ہاتھ سامنے باندھ کر بیٹھتے ہیں، گویا عمیق مراقبے میں ہیں اور اِن کی اس سواری کو کھینچنے والا نہ گھوڑا ہوتا ہے اور نہ گدھا۔ بلکہ ان کی بڈھی، بابُشکا۔ تین چار سال تک بچّے عموماً نانی دادی کے زیرِ سایہ پلتے ہیں۔ کیونکہ اِن کے ماں باپ کام پر جاتے ہیں، پھر نرسری اور بعدازاں اسکول ان کو سنبھال لیتا ہے۔

یہ تو تھا موسکو بادی النظر میں، لیکن اس کے موجودہ وجود کو سمجھنے کے واسطے ماضی کا کچھ مطالعہ کرنا پڑا، تو یہ شہر اور بھی دلچسپ معلوم ہُوا۔ موسکو مجسّم تاریخ ہے۔ اس کی ہر دیوار تاریخ کا ایک جُملہ اور ہر عمارت اس کا ایک باب ہے۔ ۱۱۴۷ء کی بات ہے کہ یہ شہر وسطی رُوس کی دُور افتادہ نیم کوہستانی بلندیوں پر ایک دریا کے کنارے گاؤں کی صُورت میں آباد ہُوا۔ اس زمانہ میں گاؤں اور دریا دونوں کا نام "موسکوا" تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک موسمِ سَرما برف و باد کے بھاری رتھ دوڑاتا ہُوا آٹھ سو بار اس بستی پر سے گزر چُکا ہے، مگر ایک مضبوط چٹان کی طرح اس آبادی نے ہر قسم کے طوفانوں کا مقابلہ بڑے استقلال سے کیا ہے۔ منگولیا، ترکستان، پولینڈ، سوئیڈن، فرانس اور جرمنی کے حملہ آور جتھے اس کے در و دیوار کے لیے شکست و ریخت کا باعث تو بنے، لیکن اس کی رُوح کچلنے اور اس کی آزادی سلب کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

روم، لزبن یا ٹوکیو کی طرح موسکو چھوٹی چھوٹی سات پہاڑیوں پر آباد ہے اور دُنیا کے سب سے بڑے شہروں میں اس کا نمبر پانچواں ہے، یہ سوئیٹ یُونین اور روسی ری پبلک دونوں کا دارالحکومت ہے۔

موسکو کا سُرخ چوک (RED SQUARE) ایک رُوح نشیں افسوں ہے، اس

کا اندازِ تعمیر مشرقی سحرِ حُسن میں کچھ ایسا ڈوبا ہُوا ہے کہ باور نہیں ہوتا کہ یہ مرجع احمر ابھی تک یورپ میں ہے۔ اس وسیع شاہراہ پر سینٹ بیزل کا گرجا (St. BASILS —— CATHEDRAL) —— اور اس کے سنہرے کلس بصلہ دار گنبد گلاب کی کلی سے مشابہ قُبّے، نجات دہندہ کا مینار (SAVIOUR'S CLOCK TOWER) اور کریملین کا قلعہ یورپ کے اندازِ تعمیر سے بالکل مختلف ہے۔ سچ پُوچھو تو سُرخ چوک کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے میں الف لیلیٰ کی دُنیا کا نظّارہ کر رہی ہوں، اُس دُنیا کا جسے ہماری دُنیا سے کوئی علاقہ نہیں، ایسی دُنیا جس کا بیسویں صدی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس وقت میرے سامنے جو دُنیا تھی اُسے داستان پارینہ کا قسطنطنیہ یا قاہرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس منظر کے لیے عصرِ حاضر کے بھاری بھر کم میل خورے سنجیدہ غیر رومانوی رُوسیوں کے بجائے ہیرے موتی سے لدے ہُوئے اُمرا اور وزراء کے جُھرمٹ، آبنوسی پالکیوں میں شاہان پُرجلال کے جلوس، حبشی غلاموں کے چمکتے ہُوئے ننگے جسم اور ننگی تلواریں، فیل پیکر پہلوانوں کے داؤ پیچ، مشّاق شعبدہ گروں کے جوہر، درباری جوتشیوں کے دائرے، سوداگروں کے خیمے نظر آتے۔ اِسی سُرخ چوک میں زربفت کی جھول اور کمخواب کے چتر سے آراستہ ہاتھی جھومتے دکھائی دیتے، نیل گُوں زین سے مزّین راہوار ہنہناتے نظر آتے، اور طلائی زنجیروں میں جکڑے ہُوئے پالتو شیر دائیں بائیں غرّاتے جاتے اور اب؟ آپ وہاں کیا دیکھتے ہیں؟ دُھواں اُڑاتی، چُوں چُوں کرتی پُرانی چھکڑا ٹیکسیاں، کوٹ پتلون میں اُڑسی ہُوئی چند کاروباری مشینیں، چند کیمرہ بردار سیّاح جو اس چوک کا عکسی ثبوت لیتے پھرتے ہیں، تاکہ گھر جاکر رُعب ڈال سکیں، سُرخ چوک کا رُوس کے سیاسی عقیدے سے کوئی واسطہ نہیں۔ رُوسی زبان میں الفاظ سُرخ اور خوبصورت

ایک ہی مادّے سے مشتق ہیں۔

موسکو کے متعلق پہلا تاثر اُس کی کُشادگی ہے، اُس کا پھیلاؤ پہلوؤں کی طرف ہے۔ گویا ایک بے ہنگم دیو کی طرح پاؤں پسارے لیٹا ہُوا نظر آتا ہے یہ نیویارک کی عین ضد ہے، نیویارک کی بلندیاں آسمانوں سے سرگوشیاں کر رہی ہیں، اگر سارس کی گردن کرائے پر مانگیں، تو آپ اس کی پھُننگ تک نظر پہنچا سکتے ہیں، موسکو کو دیکھنے کے لیے آپ کو بھارت ناٹیم ناچ کی طرح اپنی گردن دائیں سے بائیں گھمانے کی ورزش کرنی پڑے گی۔ یہ شہر اپنے قلب اور مرکز یعنی کریملن سے جو دراصل ایک جزیرہ تھا، باہر کی طرف ایک سو چھبیس مربع میل پر پھیلتا ہُوا چلا گیا ہے اور صنوبر اور سرو کے جنگلات کے لا متناہی سلسلہ میں گھرا ہُوا ہے۔

موسکو جانا اور لینن اور اسٹالن کے مکفون مُنہ نہ دیکھنا، ایسا ہی ہے کہ کسی شادی میں جانا اور دُولہا دُلہن کو رُونمائی نہ دینا۔ یہ مقبرہ اُن کے نئے سیاسی مذہب کی سرکاری درگاہ ہے۔ میرے ساتھیوں نے محض از راہِ اخلاق ان شورہ پشت رفتگان کے لیے کچھ پھول خریدنا چاہے۔ پھُول وہاں دستیاب نہیں تھے۔ آخر کچھ نیم پژمُردہ گُل داؤدی تیس روبل (۱۵ روپے) میں مل گئے۔ اِن مزاروں پر ہمارا پھُول چڑھانا ایک تکلّف ہی تھا اور تکلّف ہمیشہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس سرکاری مزار پر زائرین جوق در جوق آتے ہیں اور ان سے کئی میل لمبی قطاریں بن جاتی ہیں؛ چنانچہ ہم مزار کا دروازہ کھُلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گئے۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ بیشمار زائرین پہلے ہی ایک لمبی قطار بنائے کھڑے ہیں۔ اس وقت ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ سفید ابرق کی طرح ننھّی ننھّی بے ضرر کرچیاں سَر پر مُنہ پر جھڑ رہی تھیں، جو ہم گردن کی ذراسی جنبش سے جھاڑ

دیتے تھے۔ ہم نے سُرخ چوک کے وسیع احاطے میں ایک ایک انچ کرکے سَرکنا شروع کیا۔ اس وقت مکمّل سکوت طاری تھا، میرا قلب اس بے وجہ سناٹے سے اُلٹ رہا تھا۔ زبان سردی میں اندر پڑے پڑے اینٹھ رہی تھی اور ذرا مشقِ کلام چاہتی تھی۔ میں نے جو ذرا آواز نکالی کہ یہ رُوسی ہتھنیاں چیونٹی کی چال کیوں چل رہی ہیں، تو دو قوی ہیکل عورتوں نے مجھے اس طرح گھُور کر دیکھا کہ وہ مجھے کانٹے چھُری سے کھا سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ، مزار میں تیسری قبر کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ میں چُپ ہوگئی۔ آخر ہم مزار کے قریب پہنچے۔ مزار چپٹی طرز پر زنگاری سنگِ سماق سے بنا ہُوا ہے۔ اس کے اندازِ تعمیر کو ہم نیم جدید کہہ سکتے ہیں، دروازے پر بھاری لباس پہنے دو فوجی محافظ کھڑے تھے۔ حفاظت کی حاجت زندگی تک ہے، موت کے بعد باڈی گارڈ چہ معنی دارد؟ سیڑھیاں اُتر کر نیچے تہہ خانہ میں پہنچے، تو میرے نتھنوں میں کافور کا تیز بھپکا آیا، جس سے میری رُوح تک لرز گئی اور چشمِ تخیّل نے فوراً کفن اور گورکن سامنے سے نکلتے ہُوئے دیکھ لیے۔ میں نے جلدی سے خیالات ہٹائے، چاروں طرف سنگِ مرمر کی سفید شفّاف فراخیاں اور درمیان میں سنگین و ساکت تابوت جن میں انقلاب کے دو دلوں ہیرو لینن اور اسٹالن عمرِ دراز کی جدّوجہد کے بعد آرام کر رہے تھے۔ کمبخت خود تو سو گئے اور دُنیا کو ہلا کر اُٹھا گئے۔ یہ دو یاجوج ماجوج کیا آئے، ایک تہلکہ اپنے ساتھ لائے اور ایک قیامت اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کی لاشیں حنُوط شدہ ہیں۔ حنوط کا عمل اشتراکی حکومت کا سرکاری راز ہے۔ جسے دُوسرا کوئی نہیں جانتا۔ اسٹالن کی نسبت لینن کچھ زیادہ زرد رُو دکھائی دیتا ہے، جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ لینن بہت پہلے یعنی ۱۹۲۴ء میں فوت ہُوا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک خُفیہ جگہ سے سُرخ

روشنی مرتکز کی جاتی ہے۔اس سے ان کے چہروں پر مُردنی کم کھنڈی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔
آخر ان گزشتہ مشاہیر کے مُردہ جسموں کی یُوں کھلے مُنہ نمائش کیوں کی جاتی ہے؟ ذہن نے پُوچھا۔
قیاس آرائی بولی۔شاید یہ نمائش لوگوں کے دلوں میں لینن و اسٹالن کی یاد جسمانی طور پر زندہ رکھنے کے لیے کی جاتی ہے اور اس طرح لوگوں کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے، کہ یہ مشاہیر اب بھی ہمارے ساتھ ہیں، ان کا وجود زمانۂ حال کا حِصّہ ہے، ان کا کام اور پیغام برابر زندہ ہے اور وہ اپنے جسم اور روح کے ساتھ موسکو کی معیت میں ہیں۔رُوسی عوام کے لیے اِن سرکاری دیوتاؤں کی سمادھی پر جانا ایک گہرا جذباتی تجربہ ہے۔میں نے کئی اشخاص کو دیکھا کہ خاموشی سے آنسو پونچھ رہے تھے۔ایک عورت باہر دروازے کے پاس سسکیاں بھر رہی تھی۔انسان پیدائشی طور پر پُجاری ہے۔پوجنے کے لیے اُسے کچھ ہی دے دو۔آباؤاجداد کی کھوپڑی یا کالے ناگ کی گُنڈلی، چنڈی ماتا کی خون نوش زبان یا قدرتِ یزداں۔چلو اچھّا ہُوا میں نے اسٹالن کا چہرہ دیکھ لیا۔ایسے عالمگیری سفّاک و جلّاد کم دیکھنے میں آتے ہیں۔
میرے پیچھے تھوڑے عرصے کے بعد ہی غریب کی لاش کو کسی دُوسرے غیر معروف مقام پر پہنچا کر خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔جہاں نہ کوئی کتبہ ہے اور نہ کوئی چراغ۔بات یہ ہے کہ جب اہالیِ موسکو کو خروشیف کی بلند آہنگ تقریروں میں اسٹالن کی خونریزی اور مظالم کا پتہ چلا، جو اُس نے اپنے دورِ اقتدار میں روا رکھّے تھے، تو ان میں غم و غصّہ کی کچھ ایسی شدید لہر دوڑ گئی کہ انہوں نے مقبرے پر ہلّہ بول دیا۔اگر اس وقت پولیس آڑے نہ آتی، تو یہ لوگ اسٹالن کی لاش کو مقبرے سے گھسیٹ کر باہر لے آتے اور بر سرِ عام اس کی بے حرمتی کرتے۔کل تک رُوسی لوگ اسٹالن کی پرستش کرتے تھے، ان ہی پرستاروں کی سرکشی سے آج وہ گمنامی کی حالت میں پڑا سڑ رہا ہے۔یہ ہے انسان اور یہ ہیں انسان

کے خود ساختہ معبود! مجھے لینن سے بہت ہمدردی ہے، اُس کا اتنے برس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ بیچارہ اُس سردمرمریں مقبرے میں تن تنہا پڑا سوچتا ہوگا کہ خدا جانے پھر کب اسے انسانی صحبت میسّر آئے۔

اس کے بعد میری گائیڈ مجھے وہاں کے سب سے بڑے مرکزِ خرید و فروخت میں لے گئی۔ موسکو میں یہ سب سے بڑا اسٹور ہے۔ اسے "گُم" کہتے ہیں اور واقعی وہاں جاکر انسان گُم ہوجاتا ہے۔ اس کی عمارت صرف دومنزلہ ہے، جو چوڑے رُخ دُور تک پھیلی ہُوئی ہے۔ اتوار کو یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ اس شہر میں دُکانیں پیر کو بند رہتی ہیں، تاکہ کام کرنے والے ہفتہ بھر کی ضروریات اتوار کو خرید سکیں۔ اب اس "گم" میں چھوٹی چھوٹی دُکانوں پر ہر نوع کی افادی اشیا کی نمائش کی گئی تھی، لیکن عیش اور تکلّف کی چیزیں بہت کم تھیں۔ اشیا کی نمائش اور اسٹالوں کی زیبائش حسبِ معمول گھٹیا تھی۔ بیچنے والیاں انگریزی کا ایک لفظ تک نہیں جانتی تھیں۔ جُوتے بھدّے، بوجھل اور مہنگے تھے۔ جُوتے کے ایک معمولی جوڑے کی قیمت ڈیڑھ سو روبل تھی یعنی پچھتّر روپے۔ مجھے ان لوگوں پر بڑا ترس آیا کہ ان کی ضروریاتِ زندگی ابھی تک اتنی گراں ہیں۔ بھارت کانپور سے جُوتے رُوس کو برآمد کرتا ہے۔ اس میدان میں ہم کیوں پیچھے ہیں؟ آخر ہمارے مُلک میں تو جُوتوں کی کمی نہیں اور وہ بھی بے بھاؤ کے۔ نفع ہی نفع ہے۔ بناؤ سنگھار کا سامان بڑا فرسودہ اور خود ساختہ تھا۔ بعض عطروں کی خوشبو زلفِ بنگال تیل کی طرح میرے دماغ کے پُرخچے اُڑا رہی تھی۔ وہاں ایک خودکار مشین تھی، جس میں سے عطر کے فوّارے چُھوٹ رہے تھے۔ بعض رُوسی اپنے سر سے ٹوپی اُتارتے اور اپنے چیکٹ بال اس معطّر پھوار میں دھوتے۔ مُسلمانوں کی طرح رُوسی نہانے کے شوقین نہیں۔ صابن کی جگہ جسم پر خوشبو

رگڑ دیتے ہیں۔ کئی باتوں میں ہم اور رُوسی بالکل بھائی بھائی ہیں۔ صابن بہت مہنگا تھا۔ مقامی لپ سٹک پاؤڈر اور کریمیں ہماری "تبت سنو" کی ٹکر کی تھیں۔ اس قسم کے میک اپ کو صرف رُوسی چمڑا ہی برداشت کر سکتا ہے، ہماری جلد تو چٹخ جائے۔ پوستین کے کوٹ بہت خوبصورت تھے، مگر ان کی کٹائی ناقص تھی۔ ہر کس و ناکس انہیں خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اُنہیں صرف سویٹ یُونین کے بڑی بڑی اُجرتیں پانے والے فنکار ہی خرید سکتے ہیں۔ ایک بڑے گوشے میں سِلک جارجٹ لٹک رہی تھی۔ اس کی فی گز قیمت ۰۷روبل سے لے کر ۲۰۰ روبل تک تھی۔ ان کی حکومت کی تمام صنعت ضروریاتِ زندگی اور افادی اشیاء پیدا کرنے میں شب و روز مصروف ہے۔ ایک عورت نے مجھ سے کہا: ہم "ریولون (REVLON) اور نائیلون (NYLON) جیسی لطیف مصنوعات کا انتظار کر سکتے ہیں۔ ہم اس وقت اپنی قوم کی ٹھوس تعمیر میں مشغول ہیں۔ خروشیف نے ۱۹۶۵ء کے اپنے سات سالہ منصوبہ کے بعد ہمیں یہ اشیاء دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ وقت بھی پلک جھپکتے کٹ جائے گا۔ اس وقت تک جو کچھ ہمیں دیا جا چکا ہے، وہی ہماری توقع سے بڑھ کر ہے۔"

رُوسی عورتیں اکثر ہمارے نازک سینڈلوں کو بڑی حیرت سے دیکھتی تھیں۔ ایک دن مَیں اور مسز ہلالی ایک دُکان میں گھس رہے تھے کہ ایک بوڑھی بابشکا نے اُن کا بازو پکڑ کر اُن کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا: "یہ فیشن یہاں کی سردی میں نہیں چلے گا، مرجاؤگی۔" اس کا جواب ابھی وہ اپنی ترجمان کو دے ہی رہی تھیں کہ اتنی دیر میں پانچ دس لوگ جمع ہو گئے اور آپس میں بحث چھڑ گئی۔ ایک مرد مسز ہلالی کو مخاطب کر کے زور سے بولا: "آپ سردی سے بالکل خوف نہ کھایئے، بے شک پہنیے۔ یہ نفیس

جُوتے! ہماری تو آنکھیں ترس گئیں اس قسم کی چیزوں کو۔" امریکنوں اور یورپینوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض رُوسیوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ الیکٹرک شیور، پاکٹ فلیش لائٹ یا سگریٹ لائٹر کیا ہوتا ہے۔ ان کو یہ دیکھ کر بھی اچنبھا ہوتا ہے کہ رُوس کی لڑکیاں دھوپ کی عینکیں یا مصنوعی پلکیں نہیں لگاتیں یا "کناسٹا" کبھی نہیں کھیلتیں یا وہ کاک ٹیل پارٹیوں میں کبھی نہیں جاتیں، لیکن اُن کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آج کے رُوس کا موجودہ یورپ سے موازنہ کرنا ایک تاریخی غلطی ہے۔ خیال کیجیے رُوس آج سے پینتیس سال قبل کیا تھا؟ پھر دیکھیے کہ وہ آج کیا ہے۔ یا وہ زمانہ تھا کہ زاروں کے عہدِ حکومت میں بھُوک، افلاس، ظلم اور ابلہ فریبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یا آج اسی رُوس میں لوگوں کو ضروریاتِ زندگی، اعلیٰ صحت، سو فی صد تعلیم اور مکمّل روزگار حاصل ہے افادی اشیا کا ان سے وعدہ ہُوا تھا۔ وہ انہیں میسّر آچکی ہیں اور خاصی سستی ہیں۔ ذاتی خدمتیں جیسے طبّی اور تعلیمی انتظام بالکل مُفت ہے۔ ٹیلیفون، بجلی، مکان کا کرایہ جیسی بُنیادی ضروریات کا کُل خرچ اوسط آمدنی کا صِرف پانچ فیصد وصُول کیا جاتا ہے۔ ٹیکس ہلکے ہیں۔ رُوس میں زیادہ سے زیادہ ٹیکس تیرہ فی صد ہے۔ تقریباً تمام عورتیں کام کرتی ہیں، جس سے کُنبے کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیماری، حادثات، بڑھاپا، بیروزگاری کے لیے بیمہ اور وظیفے موجود ہیں۔

یہ ساری صورتِ حال سامنے رکھی جائے، تو دُوسرے ممالک کے مقابلہ میں رُوس کا معیارِ زندگی کچھ ایسا بُرا نہیں۔ میں نے سڑک پر کسی کو پھٹے حالوں نہ دیکھا۔ کسی کو ہاتھ پھیلائے سوال کرتے نہ دیکھا۔ ہندوستان کے سفیر نے جو عرصۂ دراز سے وہاں متعیّن تھے، بتایا کہ چند سال پہلے کچھ لوگ خستہ صُورت نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں پیرں

میں جوتوں کے بجائے ٹاٹ لپٹا ہوتا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے اُن کی حالت بہتر ہوگئی اور یہ سب ترقّی ایک قلیل عرصے میں ہُوئی ہے یہ مُلک دقیانوسی اور نیم وحشی ماحول سے چھلانگ لگا کر بیسویں صدی کے اکھاڑے میں آن کُودا ہے اور اس وقت دُنیا کی نمبر ایک NUCLEAR طاقت اور نمبر ۲ صنعتی طاقت ہے۔

اکثر سفیروں کی بیویوں کی طرح جنہیں یورپ میں خداداد فراوانی میسّر ہے، میری میزبان برابر بڑبڑاتی رہتی تھیں، خوراک رُوس میں سستی ہے، مگر اس کی تقسیم ٹھیک نہیں ہوتی۔ ایک دن گائے یا بکرے کا گوشت بکثرت، دُوسرے دن غائب۔ انسان بہرحال انسان ٹھہرا۔ رُوسی لوگ بھی بعض دفعہ خوراک کا ذخیرہ کرنے لگتے ہیں، بلکہ اُسے دبا لیتے ہیں۔ اس صُورتِ حال سے غیر مُلکی سفیر ایسے بدحواس اور اتنے محتاط ہو جاتے ہیں کہ وہ کئی کئی مہینے پہلے ہی ہزار ہا روپوں کے ڈبوں میں بند خوراک اور لطیف اشیاء باہر مُلکوں سے خرید کر اپنے تہہ خانوں میں بھر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ، اُنہیں چھوٹی سے چھوٹی چیز اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی محکمۂ اطلاعاتِ "رسد" سے جسے "بیوروبن" کہتے ہیں اور جو ان کی سرکاری ایجنسی ہے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ کسی خاص قسم کے پینٹر یا بڑھئی یا ملازمہ کی ضرورت ہو، تو بیوروبن ہی کے ذریعے درخواست کی جاتی ہے سفیروں پر یہ بات گراں گزرتی ہے۔ وہ اس بے بسی کو صبر آزما تکلیف اور اس بندش کو تضیعِ اوقات سمجھتے ہیں۔ پھول کمیاب اور مہنگے ہیں، خاص طور پر موسمِ سرما میں۔ اس لیے کہ یہ صرف بندکمروں کی مصنوعی گرمی میں اُگائے جاتے ہیں۔ میری میزبان نے ایک خاص دعوت کے موقعہ پر فن لینڈ سے ہوائی جہاز کے ذریعے گلابی کارنیشن منگوائے، جو بادا کے مول پڑے۔ خیر دعوت کامیاب رہی۔ ان پھولوں کو بہت سراہا گیا۔ معزز خواتین نے انہیں

دیکھ دیکھ کر آہیں بھریں۔ ایک دو غش کھاتے کھاتے بچیں۔ دعوت کا دن گزر گیا، مگر کئی روز بعد تک ان پھولوں کی حفاظت کی جاتی رہی۔ ان کو طرح طرح کے بتائے ہوئے کُشتے کھلائے گئے، لیکن آخر ان کی شادابی پر معیّن وقت آنا تھا۔ بعض پھول سرنگوں ہونے لگے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی پھول کملا کے گردن ڈال دیتا، تو ساتھ ہی میری سہیلی کا دل بیٹھ جاتا۔

پھولوں کے ذکر سے مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ وہ یہ کہ موسکو میں پارکوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ درخت زیادہ نہیں ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں موسکو پر ہوائی حملوں کے بعد حکومت نے اس خیالِ خام سے بے شمار درخت کٹوا دیے تھے کہ وہ زہریلی گیس اپنے اندر جذب کر لیں گے، جو لوگوں کی صحت کے لیے بہت مضر ہو گی؛ البتّہ موسمِ گرما میں رُوسی لوگ پودے اور جھاڑیاں اُگانا بے حد پسند کرتے ہیں، غریب ترین کوارٹروں میں بھی پودے باغیانہ انداز سے اپنے دھانی اور گہرے کاہی عملے کے ساتھ سرکشی پر تیّار کھڑے نظر آتے تھے۔

بحیثیتِ مجموعی موسکو اخلاقی طور پر ایک نہایت خشک، سخت گیر، مُتشرّع زاہد کی طرح ہے۔ یہاں عشرتِ شبانہ کی زندگی مفقود ہے۔ نائٹ کلب سرے سے موجود نہیں، برہنہ رقص اور فحش مذاق، چھچھوری تفریح نام کو نہیں۔ جنسی ہیجان کی بے اعتدالیوں کا بھی یہاں گزر نہیں، جس کے لیے پیرس، قاہرہ، بنکاک، لاؤس، ویگاس یا ٹوکیو الم نشرح ہیں۔ موسکو میں رات کے گیارہ بجے تھیٹر، سنگیت گھر، نغمہ و سرود کی محفلیں اور سینما کے آخری شو ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بگڑے ہوئے عیش جو سیّاح کو جو "بیلی ڈانس" یا عُریاں رقص کا عادی ہو، یہ شہر ایک تُرش رُو مولوی نظر آتا ہے۔ رُوسی لوگ نسوانی حسن

کو نہ مشتہر کرتے ہیں اور نہ اس کی تجارت کرتے ہیں، پست قسم کے جن عیش کدوں اور عشرت گاہوں پر یورپ فخر کرتا ہے، وہ موسکو میں نہیں ہیں۔ جس نوع کی لطیف اور پاکیزہ تفریح اس دارالحکومت میں ہے، اس کا ذکر میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے کروں گی۔

رُوسی لوگ صرف ایک چیز میں ذرا بے اعتدالی کرتے ہیں اور وہ ہے شراب نوشی۔ ان کے اندازِ شراب نوشی کو دیکھ کر بعض دفعہ انسان حیران ہوتا ہے کہ آیا یہ لوگ شراب مزہ لینے کی خاطر پیتے ہیں یا بلانوش بننے کے لیے، لیکن نشے کی حالت میں وارداتیں شاذونادر ہی ہوتی ہیں، جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی رُوسی خُم پہ خُم لنڈھائے تو شراب ٹخنوں تک رہتی ہے، سر کو نہیں چڑھتی۔ دُوسرے یہ کہ شراب نوشی کے زیرِ اثر ناشائستہ حرکات کرنے اور بالخصوص ایسی حالت میں موٹر کار چلانے پر بڑی سخت سزا دی جاتی ہے۔ رُوس کی مشہور شراب واڈکا ہے۔ اسے آتشِ سیّال کہا جاتا ہے۔ یہ بہت مقبول مشروب ہے۔ زاروں کے عہد سے لے کر اب تک حکومت ہی اس کی اجارہ دار رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں اس کی تجارت کو قومیانہ (NATIONALISE) نہیں پڑا۔ شراب نوشی کی حوصلہ شکنی کرنے کی خاطر، اسے بڑی مہنگی قیمت پر بیچا جاتا ہے۔ اس کے باوجود سُنا ہے کہ موسکو میں کئی "ڈبکی خانے" ہیں جہاں شرابیوں کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ بعض شرابیں تول کر فروخت کی جاتی ہیں اور بعض بوتل کے حساب سے۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں عورتیں چائے پیالی میں پیتی ہیں اور مرد گلاس میں۔ یہ بدتمیزی کی بات خیال کی جاتی ہے کہ کوئی عورت گلاس میں چائے پیے یا مرد پیالی میں۔ رُوسی سیاہ کافی اتنی تیز تھی کہ محسوس ہوا تمباکو چبا رہے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ اس ۶،۸ لاکھ کی آبادی والے، اتنے بڑے شہر میں کُل چھ بڑے ہوٹل ہیں اور یہ سب کے سب حکومت چلاتی ہے۔ ان سب میں اُکتا دینے والی یکسانی تھی۔ ان کا فرنیچر، عملہ، انتظام یہاں تک کہ طعام نامہ بھی یکساں تھا۔ غسل خانے تعمیر کرتے وقت زیبائش اور آسائش سے متعلّق تفاصیل پر توجہ نہیں کی گئی۔ وہاں ریستوران کئی ہیں۔ اگرچہ شہر چینی لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں چینی ریستوران ایک بھی نہیں۔ دو مشہور ترین ریستوران "عارات" اور "اراگوی" ہیں۔ عارات کو چلانے والے آرمینین ہیں۔ آراگوی کو جارجیئن کھانے پکانے کی خصوصیّت حاصل ہے۔ ایک رات ہم آراگوی ریستوران میں گئے۔ وہاں اتنا ہجوم تھا کہ قطاریں بندھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ ہم نے نشست صُبح سے مخصوص کرالی تھی، پھر بھی کچھ عرصہ انتظار کے بعد ایک میز ملی۔ شہ نشین میں جارجیئن آرکسٹرا دُھنیں بجا رہا تھا، جو میرے مانوس کانوں کو نیم ایرانی دُھنیں معلوم ہُوئیں۔ اس رَو میں بہہ کر میں یہ بھُول گئی کہ اس وقت میں مغربی ملحدوں کے درمیان بیٹھی ہوں۔ میں اپنے خوابوں کے سمرقند اور بخارا میں پہنچی ہوئی تھی، جہاں ہماری معاشرت کی نال گڑی ہے۔ "اوہو کہاں ہو"۔ میری دوست نے ٹھوکا دیا۔ کھانا آنے میں بڑی دیر لگ گئی تھی، خالی پیٹ تو باتیں بھی کچھ زیادہ نہیں ہو سکتیں، لیکن جب کھانا آیا، تو وہ اتنا لذیذ تھا کہ اس کی خوشبو ہی سے معدے کا مُنہ کھُل گیا۔ پہلے ہم نے تنوری نان جسے "گریاچی خلیپ" کہتے ہیں منگوائے اور اس کے ساتھ بھُنے ہُوئے چوزے کے "تکّے" کھائے، جن کی یاد سے اس وقت بھی مُنہ میں پانی بھر آیا ہے۔ لوبیا کے بیج کھٹ مٹھی چٹنی میں نہایت مزیدار بنے ہُوئے تھے۔ پھر لیلا کباب اور شیشلخ کباب آئے، یہ اور بھی لذیذ تھے حالانکہ مرچ مسالے نہیں تھے، پھر بھی یہ کھانے اتنے چٹخارے دار تھے

کہ ہمارے قورمے پلاؤ اس پر سے قُربان۔ طعام کے معاملے میں مَیں نے اس سے بہتر ذوق اور مہارتِ طبّاخی نہ دیکھی نہ چکھّی۔ میں نے اس ریستوران میں دیکھا کہ ہر طرف قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ایک پارٹی نے لوک گیت گانے شروع کر دیے، کچھ تالیاں بجا بجا کر تال دینے لگے۔ ان لوگوں میں ہنسی مذاق، بے تکلّفی اور قدرتی زندہ دلی، دیکھ کر قدرے حیرت بھی ہُوئی اور قدرے اطمینان بھی۔ لیکن سڑکوں پر عوام چلتے ہُوئے اتنے سُوکھے چہرے نظر آئے گویا کسی جنازے کو کندھا دے رہے ہوں، غالباً یہ سنجیدگی سردی کی وجہ ہے۔ واقعہ ہے کہ سڑک پر مُنہ کھولنے کو دل نہیں چاہتا۔ مُنہ کھولا اور ہوا اندر گئی۔ دانت پہلے ہی بج رہے ہوتے ہیں، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ مصائب اور بندشیں سہہ سہہ کر عوام کا دف مر گیا ہے۔ وہ کمبخت کُھلتے کُھلتے کھلیں گے۔

موسکو کی زندگی میں ایک سُہولت یہ ہے کہ وہاں بخشیش نہیں دینی پڑتی۔ ہوٹل کے خدمت گار، نقیب، بیرے نہ تو بخشیش کی توقّع کرتے ہیں اور نہ اُنہیں دی جاتی ہے، بعض غیر مُلکی سیّاح انہیں بخشیش دیتے ہیں، مگر وہ نقدی کی صُورت میں نہیں ہوتی، بلکہ جنس کی شکل میں ہوتی ہے۔ رُوسی لوگ بخشش کو اچھّا نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک یہ مزدور طبقہ کے لیے ایک مخرّب اخلاق بات ہے۔ میں نے لندن میں اس قسم کے تحفے مثلاً زیبائی زیورات۔ سُرخی پاؤڈر، صابن اور شمپو کے سیٹ خرید لیے تھے اور یہ موقعہ کے اعتبار سے بے حد اچھّے رہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ موسکو میں یہ تحفے قبُول کر لیے جاتے ہیں، لیکن جوں جوں اس سے آگے جائیں اس بخشش کو تحائف کی صُورت میں بھی قبُول نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ لوگ اسے اپنی عزّتِ نفس کے منافی سمجھتے ہیں۔ کاکیشیا اور وسطی ایشیا میں نوکروں کو پیسے دیے جائیں، تو وہ بہت بُرا مانتے ہیں۔

موسکو میں لاکھ رُوپیہ کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک لعنت سے پاک ہے جس کا نام ہے کوکوکولا۔ یہ ملعون شربت، یہ قرمزی سمِّ قاتل ہمارے غریب ملک کا قومی مشروب بنتا جا رہا ہے۔ اس مُلک سے دُودھ چھِنا لسّی چھُٹی۔ انگریز نے چائے نازل کی۔ امریکن نے کوکوکولا۔ انا للہ! خیر صاحب یہ بونی بوتل ہڑپہ سے ہونولولو تک اور آگرے سے نیاگرہ تک ہر دکان و مکان میں نظر آتی ہے اس سے کہیں مفر نہیں، اگر ہے تو موسکو میں۔ مجھے اصل میں اس سے ذاتی بُغض ہے اور اس کو مجھ سے خاص عداوت۔ جب میں اس کے دو گھونٹ پیتی ہوں، تو مردود گلے میں اٹک جاتی ہے اور سینے میں آگ لگا دیتی ہے، پھر معدے میں سے بارودی گولے اُٹھا اُٹھا کر حلق میں پھینکتی ہے۔ نہایت ناشائستہ بدلحاظ مُنہ پھٹ نشہ ہے۔ جیسے نئی نئی شہرت اور دولت ملی ہے اور پُرانے خاندانی لوگ تو اس سے پناہ مانگتے ہیں، لیکن جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ یہ کرۂ ارض پر ایک مُسلسل رشتے کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ "U.N.O." سے زیادہ اُس نے دُنیا کو متّحد کیا ہے۔ بہرحال موسکو والے بھی کسی سے کم نہیں۔ نت نئے سبز گلابی نیلے پیلے خوشبودار شربتوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ لندن اور نیویارک کی طرح یہ بھی قند، مٹھائیوں اور چاکلیٹ کے بڑے دلدادہ ہیں، ایک بات میں نے خاص طور پر دیکھی کہ لوگ آئس کریم بڑے چاؤ سے خریدتے اور مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ان کا یہ شوق قومی جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ موسکو میں آئس کریم کی ایک فیکٹری ۲۶ اقسام اور لذّتوں کی آئس کریم بناتی ہے۔ اِسے روسی زبان میں "مرزونویے" کہتے ہیں۔ آئس کریم کی زیادہ مقبول قسم جو کُوچوں اور محلّوں میں بکتی ہے، وہ ڈنڈی پر بادامی رنگ کے منجمد ڈلے کی صُورت میں ہوتی ہے۔ اُسے ہر کوئی چُوستا پھرتا ہے۔ ہم نے

بھی وہاں کڑکتی ہوئی سردی میں یہ برف کھائی۔ بے حد مزیدار تھی اور اس کے کھانے کا مزہ بھی تب ہے، جب دانت بج رہے ہوں۔ برف کچھ سامنے سڑک پر پڑ رہی ہو، کچھ پیٹ میں پڑ رہی ہو، برف کو گرمیوں میں کھانا بزدلی اور بدمذاقی ہے۔ کہتے ہیں دُوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں چرچل موسکو گیا۔ ان دنوں سردی نہایت شدید تھی۔ ہر جگہ گھُٹنوں تک برف اور کیچڑ تھی۔ بادِ یخ کے تھپیڑے انسانی جسم کو بُری طرح کاٹ رہے تھے۔ یکایک چرچل کی نگاہ افلاس زدہ بدحال لوگوں پر پڑی، جو چیتھڑوں میں کپکپاتے، ٹھِٹھرتے نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ قطاریں لگا رہے تھے۔ کس لیے؟ آئس کریم کے لیے! یہ منظر دیکھ کر چرچل بے اختیار کہہ اُٹھا:

"اِن لوگوں کو کوئی طاقت فتح نہیں کر سکتی۔"

کوئی شخص اس آہنی شکنجے میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟

اگر سُستی نہ آئے، تو قلم اُٹھائیے اور ویزا کے لیے درخواست دے دیجیے۔ آپ کو سیّاحی ویزا تیس دن کے لیے مل جائے گا۔ اس کا حاصل کرنا اب کچھ مُشکل نہیں۔ اس لیے کہ رُوسی لوگ اب اپنے بند دروازے کھول رہے ہیں اور وہ خود غیر مُلکی سیّاحوں کو آنے کے لیے دعوت دیتے ہیں۔ اب ایک تو ان میں خود اعتمادی آ گئی ہے، دُوسرے قومی فخر۔ وہ بہت ناز کے ساتھ اپنے لازوال معاشرتی ذخیرے مہمانوں کو دکھاتے ہیں۔ فراخدلی اور تپاک کے ساتھ باہر والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگر آپ کو رُوس جانا ہو تو سیّاحوں کی کسی ایسی ایجنسی کے پاس تشریف لے جائیے، جس کا رُوس کی سرکاری ایجنسی "اِن ٹورسٹ" سے سمجھوتہ ہو۔ ایک دفعہ "اِن ٹورسٹ" سے آپ کا تعارف ہو جائے، تو سب انتظامات وہ خود اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔

آپ کا ویزا بھی بنوا دے گی۔ آپ کے لیے پورا پروگرام بنائے گی۔ آپ کی آسائش اور آرام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مقامات دکھائے گی۔ اس ایجنسی کے سیر و سیاحت کے خرچ کے تین درجے مقرّر کیے ہیں۔ پہلا درجہ جسے (DE-LUXE) کہتے ہیں۔ بے حد مہنگا ہے کیونکہ اس میں سیّاح صرف تنہا سیر کرتا ہے اور اس کے لیے ہر انتظام الگ کیا جاتا ہے۔ آپ کو (DE-LUXE) کلاس کے لیے ٹکٹ تقریباً سوا سو روپیہ یومیہ فی کس کے حساب سے پڑے گا۔ اگر آپ اپنے طور پر خود سفر کرنے کے بجائے دیگر سیّاحوں کے ساتھ شامل ہو جائیں، تو اس خرچ کی شرح بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔ اس صورت میں آپ کو ۶۵ روپیہ یا ۴۵ روپیہ یومیہ فی کس کے حساب سے دینا پڑے گا۔ ظاہری نظر میں ڈی لکس (DE-LUXE) درجے کا سوا سو روپیہ بہت کھلتا ہے، لیکن اصل میں یہ خاصا سستا سودا ہے، اس لیے کہ آپ کو اس رقم میں حسب ذیل چیزیں مہیّا کی جاتی ہیں:

الف: بہترین ہوٹل میں بہترین رہائشی کمرے کا جوڑا۔

ب: دن میں چار مرتبہ کھانا۔

ج: ہر روز مخصوص وقت میں چند گھنٹوں کے لیے شوفر سمیت ایک شاندار موٹر کار۔

د: ایک ترجمان جو سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہتا ہے۔

ع: عجائب گھر اور اس قسم کے دوسرے مقامات میں مفت داخلہ۔

س: نقد پچیس روبل روزانہ۔ چھوٹے موٹے ہاتھ خرچ کے لیے مثلاً کپڑوں کی دھلائی، سگریٹ اور تھیٹر وغیرہ کے ٹکٹ کے لیے۔

"اِن ٹورسٹ" اب چالیس ممالک کی ۷۰ کمپنیوں سے تعلق قائم کر چکی ہے۔
اس کے موسکو میں اپنے چار ہوٹل ہیں۔ نیشنل۔ میٹروپول۔ سوائے لینن گراڈز کا یا۔
موسکو ایک بین الاقوامی سیرگاہ بن گیا ہے جہاں ہر مُلک کے سیّاح اور خاص طور پر
ایشیائی اور افریقی بہت نظر آتے ہیں۔

میں نے اپنی گائیڈ اور سہیلی سے جس کا نام زویا تھا اس کی جائے رہائش دریافت
کی اور کہا کہ میں اس کے بُوڑھے والدین سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے بڑی نرمی اور
سلیقے سے مجھے ٹال دیا۔ شاید اُسے اپنے دو کمروں پر مشتمل مکان پر لے جانے سے
حجاب آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ موسکو میں لوگوں کی اکثریت کی قسمت ابھی تک ایسی ہی
ہے۔ چھوٹے چھوٹے کمروں میں کئی کئی افراد کے کُنبے ٹھُنسے ہُوئے ہیں۔ بعض حالتوں
میں تو پُوری سُسرال یا سمدھیانہ بھی ساتھ ہی بندھا رہتا ہے۔ باورچی خانہ اور غسل خانہ
مُشترکہ طور پر استعمال ہوتا ہے۔ رہائشی مکانوں کا مسئلہ بڑی سُرعت سے اُونچی سطح پر حل
کیا جا رہا ہے۔ ہر تیسرے مہینے ایک نئی فلک بوس عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔ یونیورسٹی
کے قریب اور موسکو کے مضافات میں حکُومت مکانات تعمیر کرنے میں رات دن مصروف
ہے اور مجھے یقین ہے کہ چند ہی سال میں قلّتِ مکانات کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو
چُکا ہوگا۔ رُوسی لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ جب پُوری تندہی سے کسی کام کا بیڑا اٹھاتے
ہیں تو اسے بہت جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ خاندانی
منصُوبہ بندی کچھ قدرتی طور پر خود بخود ہو رہی ہے۔ رہائش کی قلّت سے لوگ شادی
دیر سے کرتے ہیں اور بچّے کم پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی آبادی میں اضافہ
بڑی معقول حد تک قابو میں ہے۔ فی الحال یقیناً یہ صورت حال ہے کہ بعض لوگ بہت

جز بز نظر آتے ہیں کیونکہ شادی شدہ لوگوں کو خلوت میسّر نہیں آتی اور نوجوان لڑکے لڑکیاں محض علیحدہ کمرہ میسّر نہ آسکنے کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے۔ تنگیٔ خانہ کی وجہ سے رات کو لوگ گھروں سے باہر نکل کر سڑکوں پر ٹہلنے آجاتے ہیں اور کھانے کے بعد پٹڑیوں پر خوب رونق ہوتی ہے۔ بیچارے سارا دن ڈربوں میں دم بخت ہو کر شام کو رسّے تڑا کر باہر بھاگتے ہیں۔

اکثر گھروں میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مکانوں کو مرکزی طور پر گرم رکھنے کا انتظام موجود ہے۔ میں جب اپنی سیر گشت سے تھک کر چُور چُور ہو جاتی، تو لیٹے لیٹے اکثر ٹیلیویژن دیکھتی رہتی تھی۔ وہاں کے ٹیلی ویژن پروگرام امریکہ کے ٹیلی ویژن پروگراموں سے مختلف ہیں۔ وہاں ٹیلی ویژن میں تجارتی پروگراموں بیہودہ اشتہاروں اور فلمی تاروں کو بالکل راہ نہیں۔ عموماً پروگرام پُر از معلومات اور پُر از تفریح ہوتے ہیں۔ میں جب وہاں تھی، تو ان دنوں "ٹالسٹائے" کا ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ موسم خزاں میں 'ٹالسٹائے' کی موت کی پچاسویں برسی منائی گئی تھی۔ میں نے اس کے مشہور ناولوں سے اخذ شدہ ڈرامے ٹیلی ویژن پر دیکھے جو پیش کش اور اداکاری کے لحاظ سے بلند پایہ تھے۔ ہماری رُوسی کورنس مریم ٹونا نے ٹالسٹائے اور دوسیتوسکی (DOSTEOVSKY) پر مجھ سے بحث شروع کر دی۔ مجھے اس پر بے انتہا تعجب ہوا کہ رُوس میں صرف خواندگی ہی نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹے طبقے میں بڑی وسعتِ نظر ہے۔ خدا جانے پاکستان میں تعلیم کب اس پیمانے پر ہو گی کہ ہماری انّائیں میرؔ اور مومنؔ یا رتن ناتھ سرشارؔ پر ہم سے تبادلۂ خیال کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رُوسی بوڑھوں، جوانوں اور بچّوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے ٹیلی ویژن ایک بہترین ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ بچّوں کے پروگرام بہترین

دماغی تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔ سائنس اور علم کو کچھ اتنے دل کش اور سادہ طریقے پر پیش کیا جاتا ہے کہ بچّہ دماغ پر بوجھ محسوس کیے بغیر سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ جہاں تک غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں کا تعلّق ہے موسکو میں B'B'C بہت مقبول ہے معقول اور متوازن ہونے کی وجہ سے اس کی نشریات بہت شوق سے سُنی اور سراہی جاتی ہیں۔

موسکو میں اخبارات ہمیں بہت رُوکھے پھیکے معلوم ہوئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ہے کہ کاغذ برطانوی اور امریکی اخبارات کی بہ نسبت چھوٹا اور ہلکا ہوتا ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ ان میں سنسنی پھیلانے والا مواد نہیں ہوتا۔ سرکاری یا غیر سرکاری افواہیں، طلاق کے مقدمات، عورتوں کے فرار اور اغوا کی داستانیں رُوسی اخبارات میں بالکل شائع نہیں کی جاتیں، تعیشی جہاز سے اُترتے ہوئے ہالی ووڈ کے اداکاروں کی تصویریں یا مرلن منرو مرحومہ (MARILYN MONROE) کی چوتھے خاوند سے ہم آغوشی کے فوٹو دائرۂ صحافت سے خارج ہیں۔ یہاں تک کہ طبّاخی کے نسخے، برج کے کھیل، معمّے، کومکس تک کے لیے ان اخباروں میں کوئی کالم نہیں ہوتا۔ قدرتی بات ہے پھر وہ اخبار بے رنگ نہ ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔ اس پر طرّہ یہ کہ آزادیٔ رائے نہ ہونے کی وجہ سے اخبارات صرف حکومت کے قصیدہ خواں ہیں اور اس کی خارجی یا اندرونی پالیسی پر کوئی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ پریس کا گلا گھونٹنا عوام کی نبض کاٹ دینے کے برابر ہے۔ عوام بذریعہ پریس جب تک اظہارِ خیالات کرتے رہیں، ان کو سیاسی دمہ یا جذباتی حبس نہیں ہوتا۔ یہ ننھّا سا نفسیاتی نکتہ واللہ اعلم حُکمران کب سیکھیں گے۔

آخر وہ لمحہ آ پہنچا جس کا مجھے شدید انتظار تھا۔ مجھے کریملین جانا تھا۔ کریملین کے

تصوّر سے ہی میری رگ رگ میں ارتعاش تھا۔ میرے جوش اور اضطراب پر زمانۂ حال ہنسے تو ہنسے۔ اس وقت مَیں تھی اور عظیم الشّان ماضی مجسّم رُوبرو۔ یہ حصنِ حصین آج سے صدیوں قبل موسکو کو حملہ آور جتھّوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر ہُوا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ محلّات اور گرجے اس میں شامل کر دیے گئے اور اب بالشویکی نظام نے بعض حِصّے عجائب خانوں میں تبدیل کر دیے ہیں۔ کریملین کی سال خوردہ خوبصورتی گہرے سُرخ رنگ کی کنگری دار فصیل، اس کے انگڑائی لیتے ہُوئے انیس بلند مینار پُرشکوہ محلّات اور کلیسامل کر سُرخ چوک کے شاہانہ رعب میں ایک حسین اضافہ کرتے ہیں۔ کریملین حکومت کا اقتدار اور اشتراکیت کا اسرار خانہ ہے، گزشتہ آٹھ سو برس میں جو ہیبت ناک اور خونچکان ڈرامے کھیلے گئے وہ اسی اسٹیج پر ترتیب دیے گئے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے مذہبی منّاد عقائد کے نام پر مفلس عوام کو پچکارتے اور پھسلاتے رہے۔ اس مقام نے جلّادوں کی بہیمانہ آوازیں سُنیں۔ اِس پر حملہ آوروں کے تاریک سائے پڑے۔ اس نے خود اپنی آنکھ سے وحشت انگیز "آئی وان" (IVAN THE TERRIBLE) کے مظالم مشاہدہ کیے۔ یہ نپولین کی ارضی حرص کا زخم خوردہ شکار اور ہٹلر کی بمباری کا نشانہ بنا۔ لینن اور اسٹالن کا انقلابی فلسفہ اور حیوانی قوانین یہیں سے نافذ ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جس میں حضرت مریم کا کلیسا شہیدوں اور بزرگوں کے مزارات سے بھرا پڑا ہے۔ اس کلیسا نے متمرد زاروں کے جشن ہائے تاجپوشی ان کے تمام شاہانہ لوازم سمیت دیکھے۔ اس کلیسا میں حضرت مریم کا مرقع ہے جسے ولاڈی میر کی دوشیزہ (THE ICON OF THE VIRGIN OF VLADIMIR) کہا جاتا ہے۔ اسے رُوس میں مقدس ترین خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مرقع مرجع توہمات ہے اور دافع حاجات

مانا جاتا ہے ـــــــ عام اعتقاد یہ تھا کہ حضرت مریم کی یہ تصویر رُوسیوں کو حملہ آوروں سے بچاتی ہے اور ان کی حفاظت کرتی ہے۔ روایت ہے کہ تیمور لنگ اپنے لاؤ لشکر سمیت موسکو کے دروازوں تک آ پہنچا تھا، مگر اس بُت کے مقدّس اثر کی وجہ سے موسکو کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر پُراسرار طور پر چُپ چاپ واپس چلا گیا۔

کریملین کے تخت والے قدیم کمرے کی دیواروں پر آبی رنگوں سے نہایت دلآویز تصویریں بنی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "پیلس آف فیلٹس ـ (PALACE OF FACETS) ـ کے ہر ستون اور غلام گردش میں ماضی کے سوانح سانس لے رہے ہیں۔ یہاں زار مکین تھے۔ یہاں خود تاریخ مکین تھی۔ یہیں وحشت انگیز آئی وان نے اپنی اُس فتح کا جشن منایا جو اسے والگا کے کنارے تاتاریوں پر حاصل ہوئی۔ یہیں پیٹرِ اعظم نے سویڈن کو شکست دے کر سلامتی کا جام پیا۔ یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں زارانِ رُوس زرّیں صلیبیں اور مرصّع سلیپر پہنے عشق و عدل، جنگ و جدل سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ یہاں کی ہواؤں میں سازشوں کی سرگوشیاں اور قتل عام کے اشارے منتشر تھے۔ یہاں ایک طرف فنونِ لطیفہ پروان چڑھے اور دوسری طرف انسانیت نے دَم توڑ دیا۔ کریملن کے شاندار محل میں جس میں سینٹ جارج کا وسیع اور عریض ہال بھی شامل ہے، اب سرکاری مہمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ مجھے اصل دلچسپی کریملین کے عجائب گھر سے تھی۔ اس میں بڑی نایاب دولت بھری پڑی ہے۔ وحشت انگیز آئی وان کا ہاتھی دانت کا تخت خاص طور پر قابلِ دید ہے۔ زاروں کے تاج یہیں دھرے ہیں۔ ایک تاج درمیان سے تربوز کی طرح کٹا ہُوا ہے۔ اس میں ۸۰۰، ۲ بڑے بڑے ہیرے ہیں۔ نارنجی رنگ کے طوطوں کے پروں سے بنے ہُوئے گھوڑوں کے کمبل، جواہرات

سے مرصّع زینیں اور لگامیں، ٹرانس سائبیرین ایکسپریس کا چھوٹا سا نمونہ جو سونے اور پلاٹینم سے بنا ہُوا ہے، حسین ترین عجائبات ہیں۔ ایک نہایت قیمتی لکڑی کی گاڑی جو ہاتھی دانت اور سونے سے مرصّع ہے اور جسے ملکہ الزبتھ نے زار گاڈنوو کو تحفہ کے طور پر دیا تھا، بے مثال صنّاعی کا نمونہ ہے۔ گاڈنوو روسی تاریخ میں پہلا بادشاہ تھا جس کا تاج و تخت کے لیے انتخاب کیا گیا۔ پھر یہاں شاہ مانو ماخ کی ٹوپی بھی موجود ہے، یہ ٹوپی قیصر روم نے تحفہ کے طور پر دی تھی۔ اسے قرنہائے بعید سے لے کر اٹھارویں صدی تک رُوس کا ہر بادشاہ اور زار پہنتا آیا ہے، میں نے حضرت عیسیٰ کا دوشالہ بھی دیکھا، بڑے دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہ انہیں کا ہے۔ گلابی دھاگوں سے اِس پر روئیدادِ صلیب کشیدہ ہے پھر ایک بہت بڑا چوبی گھڑیال بھی ہے جس پر ایک طلائی عقاب اور عقاب کا چھوٹا سا طلائی بچّہ بیٹھا ہے، قصّہ مشہور ہے کہ ہر ساعت کے بعد جب اس میں سے سُریلا نغمہ نکلتا تھا، تو عقاب کا مُنہ کُھلتا اور ایک سچّا موتی لڑھک کر چھوٹے عقاب کے مُنہ میں چلا جاتا تھا، اگلی طاق پر ایک نہایت بیش بہا بلّور میں سے لالہ کا چھوٹا سا پودا اُگ رہا تھا، جو ایک ننھے سے شعلے کی طرح تھا۔ پسے ہُوئے یاقوت اور زمرّد سے لالہ کے پھول پتّے بنائے گئے تھے۔ زاروں کے جوہریوں نے جواہر میں کیا کیا جوہر دکھائے تھے، کچھ خوشنما نقرئی طشت تھے، جنہیں لوخاں کہتے ہیں۔ ان پر بائبل اور تاریخ یورپ کے بعض واقعات مرقوم تھے۔ انتہائی حیران کُن بائبل کا ایک بھاری غلاف تھا جو ستاون پونڈ خالص سونے سے بنا ہوا ہے اور اس پر اشک رُود زمرّد جڑے ہُوئے ہیں، ان سب اشیائ سے زیادہ دلرُبا بہت بڑا ایسٹر کا انڈہ تھا، جو ملمّع کاری سے بنایا گیا تھا۔ اس کے بیرونی خول پر شاہانِ زار اور زارناؤں کی چھوٹی

چھوٹی رنگین تصویریں کھنچی ہوئی تھیں۔ خول کے اندر دو چھوٹے چھوٹے کُرے جما دیے تھے۔ جن پر شاہی خاندانوں کے شجرے کندہ تھے۔ ملکہ معظمہ کیتھرائن دی گریٹ کی پندرہ سو پوشاکوں میں سے کچھ سجی ہوئی تھیں۔ ایک اُس کی شادی کا گاؤن شانوں سے نیچا، ہیرے اور موتیوں سے ٹکا ہوا تھا جس نے اس قدیم زمانے میں فیشن کی دُنیا میں ہلچل مچا دی تھی اور سارا دربار ملکہ کے برہنہ شانے دیکھ کر سرنگوں ہو گیا تھا۔ بادشاہوں سے زیادہ پادریوں کے امیرانہ ٹھاٹھ قابلِ دید تھے۔ خانۂ خدا اور خانۂ ناخدا کے لوازم سونے اور چاندی میں گھڑے ہوئے ، مکرے در مکرے پھیلے ہوئے تھے اور یہ اتنا کچھ ابھی انقلابی لُوٹ کھسوٹ سے بچا کھچا مال ہے۔ اِسراف اور فضول خرچی کے اِن خزانوں کو دیکھ کر ہی انسان صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ رُوس میں کیوں انقلاب برپا ہُوا۔ جب عوام مسلسل فاقہ کشی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے تو شاہی اصطبل کے گھوڑوں کو سونے کی بالٹیوں میں چارہ کھلایا جاتا تھا اور مزیّن منبروں سے عنبریں وعظ اور عقیق اور نیلم کے پیالوں سے رُوحانی فلاح کے لیے آبِ مقدّس بانٹا جاتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جب میں کریملین سے باہر نکلی، تو کچھ کھوئی کھوئی ماضی کے کرّوفر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ یکایک بیسویں صدی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جہاں پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا، وہاں ایک پھیری والا پکچر پوسٹ کارڈ بیچ رہا تھا۔ آخر بادلِ نخواستہ آج کی کرخت حقیقت سے مصافحہ کرنا پڑا۔ ہاتھ تو ملا لیا، دل نہ ملا سکی۔ موٹر آگے جا رہی تھی اور میں پیچھے مڑ مڑ کر کریملین کے سنگین کنگروں کو دُھند میں حل ہوتے دیکھ رہی تھی۔

اس کے بعد میری توجّہ کا نشانہ آرٹ گیلری تھی۔ یہاں میں اختصار سے کام لوں گی کہ آٹھ سو سال میں رُوسی آرٹ جن ارتقائی مرحلوں میں سے گزرا، وہ ایک طویل اور

متنوّع داستان ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ خود میری زبان میں اتنی وسعت اور لچک نہیں کہ مغربی فنونِ لطیفہ کی فنّی اصطلاحات سے بہ تمام وکمال عہدہ برآ ہو سکے۔ بہرحال کوشش لازم ہے۔ موّرخ کا بیان ہے کہ دسویں صدی تک رُوس بربریّت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس صدی کے آخر میں "کیو" کے شہزادے نے اپنے سفیر بازنطین —— (BYZANTINE) بھیجے جو مشرقی یورپ کے گرجاؤں کی شان اور شوکت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے اور واپس آن کر "کیو" کے شہزادے کو وہ ہوشربا قصّے سُنائے کہ نہ صرف بازنطین سے عیسائی مذہب رُوس میں آیا بلکہ مشرقی یورپ کے فنون بھی اس کے ساتھ آ گئے۔ پندرھویں صدی تک رُوس اور مشرقی یورپ نے گھُل مل کر ازمنۂ وسطیٰ کا بارُعب آرٹ پیش کیا، جس کا سب سے بڑا شہکار" ICONS ہیں جو RUBLEV جیسے اُستادوں کے ہاتھوں معراج اور THEOPPANES پر پہنچے۔ اس راہ و ربط کا نتیجہ یہ ہُوا کہ رُوس اور مغربی یورپ کے درمیان خلیج گہری ہوتی گئی۔ یہ پیٹرِ اعظم کی وسیع نظر پالیسی تھی، جس کے تحت مغربی یورپ کے فنون کے لیے رُوس نے اپنے در و دربار وا کیے اور رُوسی اَدب و موسیقی نے مغربی روایات میں پرورش پانی شروع کی۔ حتّٰی کہ رُوس مغربی یورپ کا ایک کلچرل صُوبہ بن کر رہ گیا۔ ۱۸۶۰ء میں اس بیرونی تسلّط کے خلاف تیرہ آزاد منش فنکاروں کے گروہ نے بغاوت کر کے رُوس کی آرٹ اکیڈمی کے معیار بدل ڈالے۔ گوگول جیسے حقیقت پسند مصنّفوں کی تقلید کرتے ہُوئے ان فنکاروں نے ایک قومی اسکول قائم کیا اور رُوسی زندگی کی روزمرّہ سرگزشت کینوس پر نقش کرنی اور اپنے معاشرے کی آئینہ داری شروع کی۔ اس قومی طرز کا گُورپن (REPIN) تھا، جس

نے اُنیسویں صدی کے اختتام تک حقیقت پسندی کو کمال پر پہنچا دیا۔ اس حقیقت شناسی کے خلاف پھر ایک اور تحریک شروع ہُوئی جس میں " VRUBEL اور اس کے ساتھیوں نے صدا دی کہ حقیقت اب بانجھ ہوگئی اور موجودہ ماحول فرسودہ ہو گیا ہے"۔ ــــــ "پیچھے نظر ڈالو، گزشتہ صدیاں رومانوی رنگ میں شرابور ہیں، رُوسی تاریخ اور ICONS سے لبریز ہیں" VRUBEL " کے ساتھ ROERICH اور BENOIS نے مل کر تھیٹر، بیلے اور آرٹ کی دُنیا کو مالامال کر دیا۔ ادھر رُوس کے شہزادے اور سوداگر یورپ سے آرٹ خرید خرید کر اپنے محل پُر کر رہے تھے۔ ادھر رُوسی (KANDINSKY) تجریدی فن کار (ABSTRACT) جرمنی میں نئی تحریک شروع کر رہا تھا اور بیک وقت موسکو میں میلوچ اپنے نئے نئے تجریدی تجربے کر رہا تھا، لیکن افسوس کہ تجرباتی آرٹ انفرادیت کو اُبھارتا ہے اور اشتراکی فلسفہ میں انفرادیّت کی گنجائش نہیں۔ علاوہ ازیں رُوسی عوام انقلاب کے وقت جہالت اور انتشار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بولشویکی حکومت نے اس پراگندہ قوم کے لیے نظم و ضبط ہی مناسب سمجھا اور انفرادی رُجحانات کی لگام کھینچی، زندہ جدید فنون نے خود اپنی فاتحہ پڑھ لی اور فن کار ایک سیاسی پرچارک بن گیا۔ رُوس کا نامور ماورائے حقیقت پسند مصوّر (SURREALIST) چھگال دُوسرے رُوسی فنکاروں کی طرح پیرس میں پڑا جلاوطنی کے دن گزار رہا ہے۔ کینڈنسکی نے بھی راہِ فرار اختیار کی ٹیٹلن (TATLI N) اور مالوچ (MALEVICH) اپنے تہ خانوں کی گمنامی میں رفتہ رفتہ غائب ہو گئے۔

غرض یہ کہ اکتوبر کے انقلاب کے بعد کلچر ایک مرکزی وزارت بن گئی اور فنون لطیفہ ایک سرکاری محکمہ۔ تخلیق، بدائت اور قوتِ متخیلہ کے بدترین دُشمن، اصول پرستی،

روایتی پیروی اور جذباتی تشدّد ہیں۔ فن ایک روحانی ترنگ ہے، دانستہ تبلیغ نہیں۔ انقلاب کے وقت سے لے کر اب تک جو مصوّری ہوئی۔ زیادہ تر فن برائے زندگی کے اصول پر ہوئی اور خالص فنّی نقطہ نگاہ سے یہ سب یک طرفہ اور بے جان ہے۔ ان کا تمام جدید دَور کارخانوں اور کھیتوں میں کام کرتے ہُوئے مزدوروں کی شبیہوں، انقلاب کے ہیرو لینن، اسٹالن، خروشیف کی تصویروں، شعروادب کے مشاہیر کے مرقعوں پر مشتمل ہے۔ اس پیش کش کا مقصد وقارِ عمل کی عظمت کا سِکّہ دلوں پر بٹھانا اور ہتھوڑے اور درانتی کو قومی علامت کے طور پر پیش کرنا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس دَرس و تدریس سے مُنہ کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے لیکن انیسویں صدی کے اختتام سے قبل کا رُوسی آرٹ ایک جیتی جاگتی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ فطرتِ انسان و کائناتِ یزداں ہر زاویہ حسن و حقیقت سے پیش کیے گئے ہیں۔ قدرتی مناظر برّی و برفانی وسعتیں صنوبر کے جنگل روزمرّہ کے ادنیٰ واقعات یا خاص جذباتی لمحات مثلاً شکاری کی مبالغہ آمیز گپّیں اور دوستوں کے ٹھٹھے یا ایک جلاوطن کی اچھے خاندان میں اچانک واپسی بڑے حسّاس نازک رنگوں میں کھینچے ہوتے ہیں۔ آرٹ نے نہ صرف عوام کی زندگی پر روشنی ڈالی بلکہ معاشرے کے عیُوب پر سے پردہ اُٹھایا۔ اس حقیقت پسندی کی معراج (MIKOVSKY ' PEROV' REPIN' CEROV) کے آرٹ میں نمایاں ہُوئی۔ REPIN انیسویں صدی کے اختتام تک اپنے شاہکار مکمّل کر چکا تھا۔ اس کے دو شہ پارے میری نظر میں ابھی تک ہیں۔ ایک تو قزّاقوں کا جواب سُلطان کو جس میں خونی وحشی بربری کسی سُلطان کو مُنہ توڑ جواب لکھوا رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے درندگی ٹپک رہی ہے۔ ان کے فرعونی قہقہوں سے سارا کینوس گونج رہا ہے۔ دُوسرا شہ پارہ آئی وان کے ہاتھوں

اپنے بیٹے کا قتل ہے ۔ اس تصویر میں وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے ہُوئے ہے جسے اس نے خود قتل کر دیا تھا ۔ روایت ہے کہ رُوس کی تاریخ میں آئی وان جیسا جلّاد کوئی دُوسرا بادشاہ نہیں گزرا ۔ تیرہ برس کی عُمر میں تخت نشین ہوتے ہی اس نے عزیزوں، دوستوں یا رشتہ داروں کو معمولی سے اختلاف رائے پر قتل کروا دیا ۔ اُس کا تاریک عہدِ سلطنت ایک ڈراؤنا خواب تھا ۔ وہ اپنے آپ کو پہنچا ہوا ولی سمجھتے ہوئے باقی مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کو تہ تیغ کروا دیتا تھا ۔ زیرِ نظر تصویر اس موقع کی ہے، جب آئی وان نے اپنی بہو کو کسی بات پر طعن و تشنیع کی اور اُس کے بیٹے نے آگے بڑھ کر مداخلت کی تو اُس نے اپنے شاہی عصائے سے بیٹے کو ایسی کاری ضرب لگائی جو مُہلک ثابت ہُوئی ۔ اِس تصویر میں بیٹے کے جسم سے بے تحاشا خُون بہہ رہا ہے اور وہ لحظہ بہ لحظہ موت کے قریب ہوتا جاتا ہے اور رعشہ براندام باپ بیٹے کا سر اپنے سینے سے لگائے، آنکھیں پھاڑے بدحواس بیٹھا ہے ۔

جو غیر مصالحانہ حقیقت پسندی آپ کو رُوسی ادب میں ملتی ہے ۔ وہی آپ کو رُوسی کینوس پر نظر آتی ہے ۔ باریک سے باریک تفصیل بھی فطرت کے اتنی قریب رکھی جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے مصوّری نہیں فوٹوگرافی ہے ۔ اس پر جدید آرٹ چونک کر تلملا جاتا ہے اور احتجاج کرتا ہے کہ مصوّری فوٹوگرافی نہیں ہے ۔ بقول جدید فنکاروں کے وہ چاند ہی کیا جو چاند سمجھ آئے اور چاند دکھائی دے ۔ چاند عوام کو گول روپیہ معلوم ہوتا ہے ۔ شاعر کو چوکور زردی اور مصوّر کو قرمزی تکون ۔ آخر نظر نظر ہے ۔ بشر بشر ہے فنکار کا پیمانہ ایرے غیرے کا فیتہ یا ریاضی کا فُٹا نہیں ۔ اس کا ترازو الگ، باٹ الگ، شاعرانہ صداقت اور مادی حقیقت کا ایک دُوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ۔

پُشکن میوزیم (PUSHKIN MUSEUM) ایک رُعب دار عمارت میں ایک الگ ہی داستان ہے۔ وہاں ہر مُلک اور ہر تہذیب کا نمُونہ موجود ہے۔ اس ثقافت کی سلطنت کا پُورا جائزہ لینا مقصود ہو تو اس عجائب گھر میں صرف ایک بار جانا کافی نہیں اس ذخیرے میں پکاسو، وین گو، نہ غوغین اور فرانس کے تمام دُوسرے عظیم اثر پرست مصوّروں کے بہترین قدِ آدم شاہکار موجود ہیں۔ MANET, (MONET, DEGAS, LAUTREC, RENOIR) مینے، مونے، ڈیگاس، لوترے اور رینوار کے فن سے عشق رکھنے والوں کے لیے یہ عید نظّارہ ہے بعض رُوسی امراء یورپ میں یہ فنّی خزانے اکٹھے کرتے پھر رہے تھے کہ انقلاب کے سیلِ بے پناہ نے انہیں آلیا۔ ابھی ابھی مجھے یہ پڑھ کر بہت خوشی ہُوئی کہ حال ہی میں موسکو آرٹ کے گزشتہ تیس سال کی نمائش موسکو میں منعقد ہوئی جس کا تمام وزرا اور حکمانے آن کر جائزہ لیا اور ایک جدید طرزِ عمارت کو دیکھ کر خروشیف کا یہ قول کہ آخر ہر انسان کا مذاق جُدا ہوتا ہے، بڑی ہمّت افزا علامت ہے۔ تیس سال سے دبکے ہُوئے جدید آرٹ کو مال گوداموں سے نکال کر پیشِ عوام رونمائی ہُوئی اور پچاس ہزار لوگ فی ہفتہ کے حساب سے رُوس کے جدید تجریدی فنکاروں، چھگال، کینڈنسکی، فاک۔ ٹیٹلن اور یورپی کافروں کے ... شاہکار دیکھتے رہے۔ کئی رسالوں نے اپنے اداریوں میں اپیل کی کہ تجربہ کے بغیر آرٹ ترقّی نہیں کر سکتا۔ آرٹ اکیڈمی کے سابقہ صدر نے کہا کہ آرٹ مُسلسل دریافت ہے اور شکر ہے کہ سرکاری مداخلتوں کا زمانہ ختم ہُوا" میرے خیال سے رُوس میں تجریدی آرٹ کی سرکوبی نے اتنا احتجاج بلند نہیں کیا جتنا "سویٹ آرٹ" کے افسری مقیاس نے۔ آرٹ اکیڈمی کے پراگندہ دماغ اراکین سر پکڑ کر بال نوچتے ہیں کہ کس فنکار کو گزشتہ یا موجودہ یا آئندہ

سوویٹ آرٹ میں شامل کیا جائے اور کس معیار پر شامل کیا جائے اور اس پر جاری کسوٹی پر فطری جنونِ دریافت کو کس طرح پرکھا جائے۔ بہرحال اب حالات سازگار ہوتے جائیں گے اور آہستہ آہستہ جدید رجحانات پھر زوروں میں اُبھریں گے۔ فن کار کی رُوح کو کوئی نہیں کُچل سکتا۔ سٹالن کے تاریک عہد میں بھی مصوّر کا بُرش اور سنگتراش کا ہتھوڑا پوشیدہ تہہ خانوں کی گمنامی اور افلاس میں بھی چلتا رہا اور آج اس کی محنت کی فصل پک کر نمائش گاہ تک پہنچ گئی ہے۔

ایک اتوار کی صبح جو آنکھ میری کھُلی تو سرکس کے ٹکٹ سرہانے میز پر پڑے تھے۔ ہمارے میزبان ہمارے بٹوے کو کھُلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سرکس دیکھنے کے لیے بچّے بھی کیا بیتاب ہوں گے جو اُن کی ماں تھی۔ میں نے پاکستان میں زندہ سرکس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں پردۂ سیمیں پر نظّارہ ضرور کیا تھا۔ پھر ایسا موقعہ کہاں کہ میں آفاق گیر شہرت والا سرکس دیکھ سکوں۔ سرکس ہال باہر سے دُوسری عمارات کی طرح نہایت معمولی دقیانوسی عمارت تھی، لیکن اندر سے ایک شاندار اکھاڑا تھا جو مختلف عمروں اور مختلف ماپ کے بے شمار کنبوں سے بھرا پڑا تھا۔ سرکس سے زیادہ دلچسپ بچّوں کے پُرشوق سُرخ چہرے تھے۔ جیسے کرتب اور کمالات میں نے وہاں دیکھے، وہ کوپن ہیگن اور اسٹاک ہوم کے مشہور تماشوں کی ٹکر کے تھے۔ ان کو الفاظ کی حدود میں لانا ظلم ہے، شنیدہ کَے بُود مانندِ دیدہ۔ ہوائی جھولوں اور چینی نٹوں کے حیرت انگیز جوہر، ایک طرف حیوانوں نے جو اپنے کمائے ہُوئے گُنوں کا پٹارا کھولا تو ہم چپ دَم سادھ کر بیٹھے دیکھتے رہے جس ملک نے انسان سدھا لیے ہوں تو جانور کیا چیز ہیں صاحب۔ کھٹمل فٹ بال کھیلتے ہیں اور ریچھ موٹر سائیکل چلاتے ہیں اور

کیوں نہ چلائیں، آخر حیوانوں کے بھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ جس صدی میں انسان نے طیارے چلائے مصنوعی چاند اُڑائے تو اتنے حقوقِ تفریح تو حیوانوں کو بھی ملنے چاہئیں اور آخر یہی مخلوق تو ہماری گدّی سنبھالے گی۔ اب انسانی معاشرہ جب کہ خودکشی پر تُلا بیٹھا ہے اور ایک دن بھک سے اُڑنے والا ہے، تو پھر انسان کے جانشین افریقہ یا آسٹریلیا کے چند چوپائے ہی تو رہ جائیں گے۔ وہی اس سنسان کھنڈر کے بچے کھچے اسکوٹر اور ٹرانزسٹر چلائیں گے، خیر یہ تو بھیانک باتیں ہیں۔

ہمیں جواب یاد ہے، وہ ایک مسخرہ تھا اس نے ایک بالشت برابر ننّھی سی موٹر کار جو بچّوں کی پریم جتنی تھی، اسٹیج کے عین مرکز میں لاکر کھڑی کردی۔ اُس میں سے اُس نے بڑی بے پروائی کے انداز سے دو کُتّے نکالے، پھر دو بلّیاں، پھر دو خرگوش، پھر دو سُوٹ کیس اور پھر دو سفید بلّے نکالے، یہ بگھی دراصل اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں صرف ایک ڈرائیور اور ایک اٹیچی کیس بمشکل ہی سما سکتا تھا۔ واللہ اعلم! یہ حیوانی کُنبہ کا کُنبہ اس میں کیسے سما گیا۔ خیر اس سرکس کو دیکھتی جارہی تھی اور اس کا موازنہ بین الاقوامی سیاست کے سرکس سے کررہی تھی۔ کیا ڈُلکی چال! کیا دُلتّیاں! کیا اخلاقی قلابازیاں! کیا ایمانی شعبدہ بازیاں، وہی آسمان زمین کے قلابے، وہی ظاہری دکھاوے، وہی ہاتھ کی صفائی، وہی ہنٹر، وہی لگام، وہی نمائش بین عوام۔

ہم نے سوچا کہ جس قوم نے چاند پر اپنا جھنڈا سب سے پہلے گاڑا ہو اُس قوم کا سیّارہ نما (PLANETARIUM) قابلِ دید ہوگا، تو صاحب مرتا کیا نہ کرتا ہم گئے، روزانہ آوارہ گردی سے پیروں نے جواب دے دیا تھا، پھر بھی گئے اور دیکھا۔ جھک ماری۔ یہ لوگ بیرونی خلا کی تسخیر میں اس قدر منہمک ہیں کہ جلد ہی ستاروں کا "زندہ ناچ

گانا" دکھانے لے چلیں گے کہ زمین کے پردۂ سیمیں پر مصنوعی سیّارے۔ جتنی دیر میں کیمرے اپنا جعلی جال پھیلائیں گے، آپ زہرہ، زحل کو ہاتھ لگا کر واپس آجائیں گے۔ کیا جادو۔ کیا نیوکلیر بازی گری ہے! اس چھومنتر میں کہیں ہم نہ چھو ہو جائیں۔

یورپ کے ممالک کی طرح رُوس میں بھی ماضی کے عظیم مصنّفوں کا بڑا احترام کیا جاتا ہے اور انہیں زندہ رکھا جاتا ہے، مثال کے طور پر ٹالسٹائے، گورکی، گوگول، پشکن، چیخوف کے گھروں کو عجائب گھروں میں منتقل کر دیا گیا ہے، جن میں ان کے استعمال کی چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان چیزوں سے ان ہستیوں کی طرزِ زندگی اور عادات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں نے اپنے موٹر ڈرائیور سے انگریزی میں کہا: مجھے چیکوو کے گھر لے چلو، وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ میں نے دوبارہ یہی بات زیادہ زور سے کہی، اس پر اُس نے زور سے سر مار کر کہا، آپ کی مراد "چے خف" سے ہے۔ میں نے کہا، مراد میری ایک ہی ہے تلفّظ خواہ کتنے ہی ہوں۔

بدقسمتی ہے ان تمام عجائب گھروں پر تبصرے اور ان کے تاریخی کوائف رُوسی زبان میں ہیں اور وہاں کے گائڈ انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ایک دفعہ تو میں خود سخت اُلجھن میں پڑ گئی۔ اس لیے کہ میری اپنی رہبر زدیا غائب تھی اور میرے ساتھ نہیں جا سکی تھی۔ بہرحال ٹالسٹائے کی زندگی کے کئی پہلوؤں کا فوٹو کے سلسلوں سے اندازہ ہوا۔ اِس کی ابتدائی فوجی زندگی، اس کی ازدواجی زندگی، اس کے دیہاتی تجربے اور کھیتوں میں کسانوں کے ساتھ خورونوش، اس کی چیخوف، گورکی، پشکن جیسی شخصیتوں سے دوستانہ صحبتیں وغیرہ، اُس کے مشہور ناولوں کے نمایاں واقعات مصوّری کے رنگوں میں کھنچے ہوئے، اُس کے جنازے کے فوٹو، جن سے اندازہ ہوا کہ اس کی موت پر کس حد تک

ساری قوم نے ماتم کیا تھا۔ ٹالسٹائے کا مزار موسکو سے ۰۰ میل دُور، اُس کے اپنے دیہاتی گھر میں، درختوں کے جُھنڈ تلے، پھولوں سے لدا ہُوا ہے۔ سنگ و خشت سے معرّیٰ یہ ایک گلگوں بستر ہے، جس میں ایک اعلیٰ شخصیت خوابیدہ ہے۔

رُوس کی تعلیمی حالت کا مطالعہ کرنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رُوس کے موجودہ دَورِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ وہاں کی تعلیم ہے، جس نے ایک ہی نسل میں رُوسی لوگوں کی ذہنیت یکسر بدل کر رکھ دی ہے۔ رُوسی حکومت نے ایک ایسی قوم کو بیس سال کے اندر اندر سو فیصد خواندہ بنا دیا ہے، جو ہزارہا سال سے تاریکی اور جہالت کی دلدل میں بُری طرح پھنسی ہوئی تھی؛ چنانچہ تعلیم پھیلانے کے لیے اس حکومت نے ہر جدید ذریعے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، شبینہ اسکول سے پُورا پُورا کام لیا ہے۔

ایک شاداب رُخ رہبر جس کا نام ملیا ویر دینیا تھا اور جو وزارتِ تعلیم سے متعلّق تھی مجھے اور میرے بچّوں کو ایک سرکاری اسکول میں لے گئی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں بہترین اسکول دکھانے کی کوشش کی جائے گی، لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہاں تمام سرکاری اسکول ایک جیسے ہیں۔ ان کا نصاب اور درس و تدریس کی تکنیک ہر لحاظ سے مکمّل طور پر یکساں ہے۔ موسکو میں کل آٹھ سو اسکول ہیں۔ ان میں تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ پڑھائی کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ کتابیں بے حد سستی ہیں۔ دوپہر کا گرم کھانا ۱۲ آنے میں مل جاتا ہے، جو یورپی معیار کے اعتبار سے بہت سستا ہے۔ سواری کے لیے کچھ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ عمارتوں کے ہر بلاک میں ایک ایک اسکول موجود ہے۔ بچّوں کے اسکول جانے کی عمر سات سال سے لے کر ۱۷ برس تک کی ہے۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے امتحان بہت سخت ہے۔ تعلیم کی منصوبہ بندی کچھ ایسے ماہرانہ طریقہ پر کی گئی ہے کہ اساتذہ

کی قلّت کبھی نہیں ہوتی، معیارِ تعلیم خود ایک امریکی مصنّف کی رائے کے مطابق امریکہ کے اسکولوں کی بہ نسبت بہت بلند ہے۔ ایک امریکی طالب علم جتنا علم بارہ سال میں جذب کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ علم رُوسی طالب علم دس سال میں حاصل کر لیتا ہے۔ معیارِ تعلیم اس لیے بلند ہے کہ وہاں چھ گھنٹے کا اسکول اور پھر گھر پر بے شمار محنت اور ہفتہ میں صرف ایک "چھُٹّی" ہوتی ہے۔ روسی طالب علم سے اسکول میں اور گھر پر دونوں جگہ بڑا سخت کام لیا جاتا ہے۔ رُوسی ٹیچر کو پرائمری اسکول میں اپنی ملازمت کے پہلے تین سال کے اندر پانچ سو اسّی روبل (تقریباً تین سو روپیہ) ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اعلیٰ گریڈ میں یہ تنخواہ سات سو روبل ہو جاتی ہے۔ بیس سال کی ملازمت کے بعد وہ ۳۵۰ روبل ماہوار پنشن پر ریٹائر ہو جانے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ محکمۂ تعلیم میں عورتوں نے حکومت کا سب سے زیادہ ہاتھ بٹایا ہے۔ تمام اساتذہ میں ۷۰ فی صد عورتیں ہیں۔ وہاں کی عورتیں اگر مردوں کی نسبت زیادہ کام نہیں کرتیں، تو ان کے برابر ضرور کام کرتی ہیں۔ اس طرح وہ قومی بوجھ کی حِصّہ داری میں برابر کی شریک ہیں۔

سٹالن نے مخلوط تعلیم ختم کر دی تھی۔ ۱۹۵۴ء سے یہ پھر رائج کر دی گئی ہے اور اب یہ ہر جگہ رائج ہے۔ جس خاص اسکول میں ہمیں لے جایا گیا، اس کا کوئی نام نہیں تھا، بلکہ دکانوں کی طرح اُس کا بھی ایک نمبر تھا۔ اسکول کی عمارت واجبی سی تھی، مگر ایک بڑے وسیع میدان میں واقع تھی۔ اس کے ہیڈ ماسٹر نے ہمیں رُوسی ڈاک کے ٹکٹ، پن اور بعض تحائف یادگار کے طور پر پیش کیے۔ رُوسی ٹکٹ بڑے خوبصورت اور متنوّع ہیں۔ ایک ٹکٹ پر اسکاٹ لینڈ کے شاعر رابرٹ برنز کی تصویر تھی۔ ہمیں اسکول میں ہر طرف پھرایا گیا اور ہم نے اسکول کے ہر حِصّے اور اس کی ہر سرگرمی دیکھی۔ پُرانی طرز کے صاف سُتھرے اور

کشادہ کمروں میں لینن۔ ٹالسٹائے اور مایاکووسکی کی تصاویر آویزاں تھیں۔ بچّے، بالخصوص کنڈرگارٹن کے طلبا، زندہ دلی اور بشاشت کے لحاظ سے بالکل پٹاخے تھے۔ ایک لڑکی مجھے خاص طور پر ابھی تک یاد ہے۔ اس کی عمر بمشکل چھ سال تھی۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، کشادہ پیشانی، انگاروں کی طرح دہکتے ہُوئے گال، سیاہ بالوں کی چھوٹی سی چٹیا پیچھے کسی ہُوئی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی سب سے آنکھ بچا کر چپکے چپکے ایک سموسہ کُتر رہی تھی۔ اس ننھّے شرارے کا حُسن اور شرارت میرے دل میں گھر کر گیا۔ وہاں لڑکے گہرے خاکستری رنگ کا لباس پہنتے ہیں اور لڑکیاں کالی سکرٹیں۔ طلباء کے اپنے میں سے منتخب کیے ہوئے نوخیز لیڈر (RED PIONEERS) اپنی گردن کے گرد سُرخ رُومال پہنتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کی کمیونسٹ لیگ کے بڑے سرگرم رُکن تھے۔ امتحان میں کامیاب ہونے والے طلباء کی فی صد تعداد بہت زیادہ ہے۔ بہت کم طلباء فیل ہوتے ہیں۔ اس سال گیارہ سو طلبا میں سے صرف پچاسی طلباء فیل ہوئے۔ سکول سے اخراج کی سزا نہیں دی جاتی۔ یہ سزا انتہائی شدید قصور پر آخری چارۂ کار ضرور ہے، لیکن عام طور پر اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس میں کوئی پرائیویٹ اسکول موجود نہیں جہاں اس قسم کا سزا یافتہ طالب علم داخل ہو سکے۔ سائنس کی اہمیّت سب مضامین سے زیادہ ہے اور سائنس کو وہی اقتدارِ حکومت حاصل ہے جو دراصل کبھی مذہب کو میسّر تھا۔ کیمسٹری فزکس اور بائے اولوجی لازمی مضامین ہیں۔ اس کے برعکس امریکی اسکولوں میں بمشکل ۲۰ فی صد طلباء یہ مضامین لیتے ہیں۔ امریکی سیّاح گنتھر کا اعتراف ہے کہ اوسطاً ایک سترہ سالہ رُوسی لڑکا اسکول کے اختتام پر امریکہ کے کالج گریجویٹ سے زیادہ سائنس جانتا ہے ہر روسی طالب علم ریاضی کی اہمیّت کی وجہ سے رُوسی زبان کے ساتھ یہ مضمون ضرور

اختیار کرتا ہے۔ تمام مضامین لازمی ہیں۔ صرف غیر ملکی زبانیں اختیاری مضمون ہیں۔ غیر ملکی زبانوں میں انگریزی بہت مقبول ہے۔ ستّر فی صد رُوسی طلبا انگریزی کے مضامین پڑھتے ہیں۔ مقبول غیر ملکی زبانوں میں جرمن دُوسرے نمبر پر ہے۔ آرٹس میں چھ سال لگتے ہیں اور موسیقی میں سات سال۔ کھیل لازمی ہے۔

اس کے بعد ہم نے موسکو یونیورسٹی کا دَورہ کیا۔ یہ یونیورسٹی شہر سے دُور ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ یہ تمام شہر کی مایۂ ناز عمارت آسمان سے سرگوشی کر رہی ہے اور نیم رُوسی نیم طرزِ جدید کا نمُونہ ہے۔ شہر پیرس کے اَیفل ٹاور کو چھوڑ کر سارے یورپ میں یہ بلند ترین عمارت ہے۔ یہاں پر بھی وہی بشّاش چہرہ ہماری گائڈ تھی جو اسکول میں میرے ساتھ تھی۔ کچھ دیر میں ایک نوجوان پروفیسر کو بھی ہمارے ہمراہ کر دیا گیا جو ہمیں یونیورسٹی کے مختلف حِصّے دکھاتا پھرا۔ ساری کی ساری یونیورسٹی دیکھ سکنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے کہ اس میں ۱۹۰۰ سو تجربہ گاہیں اور ۱۵ ہزار کمرے تھے۔ لطیفے کے طور پر ہمیں بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص اس یونیورسٹی کی عمارت میں پیدا ہوا اور وہ اس کے ہر کمرے میں محض ایک دن بسر کرے، تو جب وہ تمام کمروں میں رہ کر باہر نکلے گا، تو ساٹھ برس کا ہو چکا ہوگا۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اگر ہم یونیورسٹی کی عمارت کی تمام غلام گردشوں میں سے ایک بار گزریں تو ہم ۹۰ میل کا سفر طے کریں گے۔ یہ عمارت حکومت کی انعامی نمائش گاہ ہے اور تین ملین رُوبل کے صرف سے پانچ سال ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۳ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس میں اساتذہ کی تعداد ۱۸۰۰ سو ہے۔ ۱۷ ہزار طلبا دن کو پڑھنے والے اور چھ ہزار طلبا شبینہ اسکولوں یا خط و کتابت سے تعلیم حاصل کرنے والے ہیں۔ گریجویٹ

ہونے کے بعد اُوپر کی جماعتوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد پندرہ سو ہے ۔ مرکزی عمارت میں ۳ ہزار طلباء کے لیے سائنس کی تعلیم اور ریسرچ کا انتظام ہے۔ اس یونیورسٹی میں میڈیسن انجینئرنگ یا لبرل آرٹس کی تعلیم نہیں دی جاتی ۔ ان کے لیے علیحدہ درس گاہیں ہیں، پروفیسروں کو بھرتی نہیں کیا جاتا بلکہ الیکشنوں کے ذریعہ چُنا جاتا ہے۔ یہ تقرّر صرف پانچ سال کے لیے ہوتا ہے ۔ اس کے بعد ہر پانچ سال کے بعد اس معاہدے میں توسیع کی جاتی ہے ۔ نوکری چھن جانے کے خوف سے پروفیسر خوب چاق و چوبند رہتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں ۔ ۶۵ فی صد طلبا کا مقصودِ نظر سائنس کی تحصیل ہوتا ہے ۔ ان طلبا میں سے ۵۱ فی صد عورتیں ہوتی ہیں ۔ آج کل امریکہ بہت کوشش کر رہا ہے کہ اس کے طلبا کی اکثریّت بھی سائنس کی طرف راغب ہو، لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا ۔ باہر سے آنے والے طلباء کے لیے ہوسٹل موجود ہیں ۔ ایک سادہ کمرے کا کرایہ جس کے ساتھ غسل خانہ اور ڈریسنگ روم ہوتا ہے، ۲۱ روبل یعنی ساڑھے دس روپیہ ماہوار ہے ۔ شادی شُدہ طلباء کے لیے خاص دہرے کمرے ہوتے ہیں، ہر روسی طالب علم کو کالج جانے پر پیسے دیے جاتے ہیں ۔ جیسا کہ قارئین جانتے ہیں، یورپ، امریکہ اور ایشیا کے اکثر کالجوں میں طلبا کو اتنا روپیہ اپنے پلّے سے خرچ کرنا پڑتا ہے کہ یہ رقم والدین کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتی ہے، لیکن رُوسی طالبِ علم کے لیے یہ قطعاً کوئی مسئلہ نہیں ۔ اُسے ۳۵۰ روبل سے لے کر ۵۰۰ رُوبل تک پانچ سال تک وظیفہ کے طور پر دیے جاتے ہیں، زیادہ ہونہار اور قابل طلبا کو اس وظیفے کے علاوہ کچھ بونس بھی دیا جاتا ہے ۔ ان میں سے اکثر کو فوجی سائنس سے مستثنےٰ کر دیا جاتا ہے ۔ پھر ہر طالب علم سے وعدہ ہوتا ہے کہ کالج کی تعلیم مکمّل کرتے ہی

اُسے ملازمت دے دی جائے گی۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوان سائنسدانوں کو دُنیائے صنعت میں دو ہزار سے تین ہزار روبل ماہوار کی نوکری مِل جانا یقینی ہوتا ہے جس معاشرے میں بیروزگاری نہ ہو اور ہر کالج گریجویٹ کو نوکری دینے کی حکومت ذمّہ دار ہو، وہاں ذہنی انتشار اور مایوسی کیسے پیدا ہو سکتی ہے اس لیے موسکو میں لڑکے بے کار سیٹیاں بجاتے اور آوارہ دُھنیں گاتے نہیں دکھاتی دیتے۔ امتحانوں کا معیار بے حد اُونچا ہوتا ہے، اس لیے کہ محافظانِ تعلیم کو نہ تو عوام کی خوشنودی کا خیال ہوتا ہے، نہ طلبائے کے والدین کی خوشامد مقصود ہوتی ہے اور نہ یونیورسٹیوں کے درمیان جھُوٹے وقار کی خاطر حسد وغیرہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ طلبا پاس کرنے کی کوشش کریں۔ کسی قسم کی کوئی رعایت ان امتحانوں میں روا نہیں رکھی جاتی۔ یونیورسٹی کے گریجویٹ کو معاشرے میں بڑا احترام حاصل ہوتا ہے۔ روسی لوگ کتابوں کے بہت بھُوکے ہوتے ہیں۔ سال بھر میں ساری دُنیا میں شائع ہونے والی کتابوں کی سب سے بڑی تعداد رُوس میں شائع ہوتی ہے۔ رُوس میں ۲۱۳ پبلشنگ ہاؤس ہیں، جو ایک سو بائیس زبانوں میں کتابیں چھاپتے ہیں۔ ان تمام کُتب میں ساٹھ فی صد کُتب طبعی اور مقرون (NATURAL & APPLIED SCIENCE) سائنسوں پر ہوتی ہیں۔ ان مضامین پر فرانس میں ۲۹ فی صد اور برطانیہ میں ۲۲ فی صد کتابیں لکھیں اور شائع کی جاتی ہیں۔ اپنی معلومات بڑھانے کا شوق اور علم کی تشنگی روز افزوں ہے۔ مختلف دعوتوں پر لوگ مجھ سے کتابوں پر ضرور گفتگو کرتے رہے۔ رُوسی اہلِ علم بڑے طبّاع مترجم ہیں۔ ان کے نامور شعرا اور نثر نگار مثلاً پاسترنک اور مارشک، نے انگریزی ادب کے بہترین ترجمے کیے ہیں، مارشک نے رابرٹ برنس اور بائرن کی شاعری کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

جن لوگوں کو انگریزی اور رُوسی دونوں پر پُورا عبور حاصل ہے، ان کی رائے ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ ہونا ممکن نہیں شیکسپئیر کا مطالعہ روسی زبان میں سارے مُلک میں بڑے شوق سے کیا جاتا ہے اور اسے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دراصل ماسکو میں شیکسپئیر کی پرستش ہوتی ہے۔ مجھے برطانوی سفارت خانے میں بتایا گیا کہ ایسا بھی ہُوا ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف تھیٹروں میں شیکسپئیر کے گیارہ ڈرامے دکھائے جا رہے تھے۔ روسی لوگ طبعاً بڑے رومان پرست ہیں۔ منظوم ڈرامے، تاریخی کردار، شاہانہ قیمتی لباس، دھول دھپا، عشق و قتل، جنگ و جدل، شخصیتی تصادم، ڈرامائی سین پر حال کھیلنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے کی کہانی بہت دلچسپ اور دلگیر ہونی چاہیے۔ شیکسپئیر میں انہیں یہ سب کچھ مل جاتا ہے، بلکہ اس سب کچھ سے بھی کچھ زیادہ۔ رُوسی زبان میں ہملیٹ کو گیملٹ اور میکبتھ کو مکدُوف کہتے ہیں (انا للہ) اگر اسٹیج پر مجھے کوئی "گیملٹ" کہے تو میں خودکشی کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کروں۔

صرف چند کتابوں کے علاوہ ہر اہم انگریز، یورپی اور امریکی مصنّف کا ترجمہ رُوسی زبان میں ہو چکا ہے، وکٹر ہیوگو، والٹر سکاٹ، روسو، زولا، چارلس ڈکنز، ٹامس ہارڈی اور جارج برنارڈ شا اور مارک ٹوین کی تصانیف بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ عصرِ جدید کے ڈراما نویس بھی بہت مقبول ہیں۔ ٹینیسی ولیمز، آرتھر ملر، پریسٹلے، نوئل کاورڈ۔ زیٹیگین اور اس نئی پود کا آزاد منش گروہ جو تحسیلِ جواناں کے نام سے احتجاجی ادب مرتب کر رہا ہے مثلاً آرنلڈ وسکر، آوسبرن۔ برین، جون وین وغیرہ کی تصانیف آپ کو موسکو کے طاقوں پر عام دھری ہوئی ملیں گی۔

بھارتی ادب اور کلچر کی وہاں بہت جستجو اور عزّت ہے۔ ٹیگور، منشی پریم چند،

سروجنی نائیڈو، گاندھی، کنہیالال کپور، ابوالکلام آزاد، نہرو، رادھاکرشن اور ملک راج آنند وغیرہ کی تصانیف ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر ہماری کسی نے نمائندگی کی ہے، تو فیض احمد فیض نے۔ ان کا نام کئی زبانوں پر تھا اور ان کے روسی ترجمے خاصے مقبول ہیں۔

روسی لوگ بہترین ماہرینِ السنہ ہیں۔ جب وہ کوئی زبان سیکھنے پر آجاتے ہیں، تو اہلِ زبان کو مات کر دیتے ہیں۔ روسی وزارتِ خارجہ کے چند اعلیٰ ارکان فارسی اور اُردو بے تکان بولتے ہیں۔ ایک افسر نے تو قلعۂ معلّیٰ کی وہ زبان چھانٹی کہ میری زبان تو ٹیڑھی ہونی شروع ہوگئی۔ ایک روسی سے ادبی قسم کی اُردو بگھارنے کے لیے بہت بڑا جگرا چاہیے۔ وزارتی ڈیلیگیشن جو لاہور آیا تھا، اس کا ترجمان اتنی بامحاورہ اور صحیح اُردو بولتا تھا کہ اُس کے سامنے مجھے مُنہ کھولتے ہُوئے شرم آرہی تھی۔ روسی حکومت کا یہ قاعدہ ہے کہ جس آدمی کو کسی ملک کا سفیر بنا کر بھیجنا مقصود ہو اُسے پہلے اس ملک کے معاشرے میں کامل تربیت دی جاتی ہے۔ سُنا ہے کہ روسی سفارت خانہ کے کئی اہلکار بہت اچھّی اُردو بولتے ہیں۔

سوویٹ یونین نے جہاں کلچر کی وزارت الگ بنائی ہے، اسی طرح کھیلوں کے لیے الگ محکمہ مقرّر کیا ہے۔ رُوس نے ۱۹۵۶ء میں ملبورن میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں فتح حاصل کی، پھر ۱۹۶۰ء میں دوبارہ روم میں۔ کھیلوں میں رُوس دُنیا بھر میں پیش پیش ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم کی پرورش وہاں ایک قومی مسئلہ ہے۔ اسکول میں نصاب کا حِصّہ ہے اور اس کے لیے حکومت کا محکمہ دن رات سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ رُوسی لوگ جب کسی مقابلے میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیں، تو پھر وہ اس پر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور خون پسینہ ایک کرکے ہر پُرانے ریکارڈ

کو توڑنا چاہتے ہیں۔ ایتھلیٹکس (کسرت) میں وہ دُنیا کی تمام اقوام سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ اس وقت رُوس میں ایک کروڑ نوّے لاکھ ایتھلیٹ ہیں جو مختلف کلبوں سے وابستہ ہیں، مگر کھیل کے میدان میں رُوس کا قومی جنون فٹ بال اور شطرنج پر آ کر کمال کو پہنچتا ہے۔ رُوسی لوگ ٹینس اچھّی کھیلتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کھیل وہاں پر زیادہ مقبول نہیں۔ تعجّب ہے کہ رُوس میں ایک بھی گولف کورس موجود نہیں۔ حالانکہ وہاں کے ہموار میدان اس کھیل کے لیے بہترین ثابت ہوتے۔ تیراکی بھی ایک عام شغل ہے۔ میں نے اکثر رُوسیوں کو تالابوں میں غوطے کھاتے دیکھا۔ یونیورسٹی میں تیراکی دیکھی۔ وہ مخلوط تھی۔ وہاں اکثر کھیل مخلوط ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں سب ہی ان میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک پُرانے گرجے کو ڈھاکر اُسے پبلک کے لیے ایک کُشادہ کھُلے تالاب (OPEN AIR SWIMMING POOL) میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ موسکو کا یہ کھُلا تالاب رُوس بلکہ شاید سارے یورپ میں سب سے بڑی کھُلی شناگاہ ہے، اسے مرکزی طور پر گرم کیا جاتا ہے اور ڈاکٹری سارٹیفکیٹ دکھانے کے بعد داخلے کی اجازت ملتی ہے۔ میں ایک دن کار میں جا رہی تھی۔ اُس وقت درجۂ حرارت صرف بیس درجہ زیرِ صفر تھا۔ کچھ فاصلے پر مجھے بخارات کے بادل سے اُٹھتے ہُوئے دکھائی دیے۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ بمشکل پُوچھ پائی، یہ بخارات کہاں سے اُڑ رہے ہیں؟ جواب ملا لوگ کھُلے تالاب میں نہا رہے ہیں۔ یہ رُوسی لوگوں کی سخت جانی کا برسرِ عام دُوسرا مظاہرہ تھا۔ خروشیف کڑکڑاتی سردی میں کھُلے ہوائی اڈے پر اپنے مُمتاز مہمانوں کا نہ صرف خیر مقدم کرتا ہے، بلکہ جان جان کر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے اور مہمانوں کی جوابی تقریر سُن کر ساری متعلقہ رُسوم ادا کرتا ہے۔ اس دوران میں آسائش پرورده سفرا اپنے دستانے میں ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ

ملتے اور خروشیف پر لعنتیں بھیجتے رہتے ہیں۔ رُوسی لوگ بہت ہی سخت جان ہیں۔

اب جب کہ میں نے خروشیف کا ذکر چھیڑا ہے تو اس کے متعلق کچھ اور باتیں بھی کہہ ہی ڈالوں۔ میں نے خروشیف کو دو تقریبوں پر دیکھا۔ یہ تقریبیں کمبوڈیا کے شہزادے اور اس کی حسین شہزادی اور فن لینڈ کے صدرِ اعلیٰ کے اعزاز میں استقبالیہ دعوتیں تھیں۔

خروشیف جب تک سنجیدہ رہتا ہے، وہ گلیکسو بے بی کی مانند گول مٹول موٹا تازہ بوا معلوم ہوتا ہے۔ جونہی وہ ہنسا اور دانت نکالے اور میرا دم نکلا کہ اللہ خیر! کہیں پنجہ نہ مار دے، اُس کی آنکھیں ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہیں۔ ملنے میں نہایت بااخلاق ہے اور اپنے سارے وزراء کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ بے تکلّف، ہنس مکھ اور دلچسپ ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اِس طرح ہوا کہ ایک شام رُوسی حکومت نے کمبوڈیا کے شہزادے اور اُس کی جامہ زیب شہزادی کے لیے دعوتِ ملاقات دے رکھی تھی۔ کمبوڈیا کا شہزادہ جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ اپنے محل کی راج نرتکیاں ضرور لے جاتا ہے۔ ہر ملک اپنا کلچر برآمد کرنا چاہتا ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن رُوس میں کمبوڈین بیلے (BALLET) لانا اُلٹے بانس بریلی کے مصداق ہے۔ خیر گردشِ جام کے بعد سب بیٹھ گئے۔ شہزادے نے تالی بجا کر کچھ اشارہ کیا۔ کمبوڈیا کے وزیر اور افسر پردوں کے پیچھے بھاگے۔ کچھ سرگوشیوں کچھ کھسر پھسر کے بعد پردہ ہٹا، پٹارہ کُھلا، ایک لہلہاتی ناگن یعنی ایک پتلی کمر نازنین بل کھاتی نکلی۔ پانچ منٹ تک بل کھاتی رہی۔ پھر بل کھاتی ہوئی غائب ہو گئی۔ سب نے مُسکرا کر تکلفاً تالیاں بجائیں۔ پھر باقاعدہ شاہی بیلے شروع ہوا۔ رام لیلوی لباس میں دو لڑکیاں اور ایک خواجہ سرا اسٹیج میں۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھائے، پھر بازو اُٹھائے۔ دس منٹ بعد قدم اُٹھائے۔ آدھے سوئے آدھے

جاگے ، پُورے دو منٹ ہیں ہاتھ مغرب سے مشرق تک پرنام کے لیے جا تا تھا۔ وہ کیا سوئے کہ حاضرین سو گئے سوائے کمبوڈین شہزادے کے جو چاروں طرف فخر سے نظر ڈال رہا تھا۔ گویا کہ کریملین فتح کر لیا۔ مجھے ناچ سے زیادہ پہلی قطار میں دلچسپی تھی۔ سوائے خروشیف کے "پریذیڈیم" کے سارے ممبران آنکھیں بند کر کے ناچ دیکھ رہے تھے اور وزیرِ خارجہ گرومیکو خرّاٹے لینے کے قریب تھا، لیکن شاباش ہے خروشیف کی ہمت پر کہ ستّر منٹ کی قید بامشقت کو خندہ پیشانی سے کاٹتا رہا۔ مسز خروشیف دیکھنے میں ایک سیدھی سادی بھاری بھر کم طویل القامت چوڑے چکلے اعضا والی عملی سی خاتون ہیں ان کی افتادِ طبع دوستانہ ہے اور وہ ایک ماں کی طرح شفقت سے پیش آتی ہیں کالے رنگ کا لباس اُنہیں زیادہ پسند ہے۔ وہ ایک بہت بڑے اسکول میں پڑھاتی رہی ہیں اور اب بھی دُوسری عام عورتوں کی طرح کام کرنا پسند کرتی ہیں۔ وہاں کی وزیرِ صحت بھی ایک عظیم الجثّہ خاتون ہیں جو ساری بین الاقوامی صحّت کا بیمہ معلوم ہوتی ہیں۔

موسکو میں میرے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث "بیلے" (BALLET) تھا۔ رُوسی بیلے کا دُنیا میں کوئی جواب نہیں ۔ اس رقص نے جنم اٹلی میں لیا اور پروان فرانس اور انگلستان میں چڑھا۔ رُوس میں یہ بہت بعد میں پہنچا۔ اس کے باوجود، اس فن میں آج روس ساری دُنیا کو مات دے چکا ہے اور دُنیا بھر میں چوٹی کی رقاصائیں رُوسی ہی ہیں۔ کلاسیکل آرکسٹرا کی معیّت میں پنجوں کے بل ناچا جانے والا یہ رقص، ابتدا میں محض حکمرانوں اور اُمراء کے لیے ایک لطیف سی تفریح تھا، لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اسے رُوسی عوام نے اپنے فطری مذاقِ سلیم اور زکی ستائش سے سینچا۔ شعراء نے رُومان لکھے، موسیقاروں نے اس پر دھنیں بٹھائیں، فن کار نے اس کے

مناظر میں رنگ بھرے۔ اب یہ رقص پیچیدگی اختیار کرتے کرتے ایک انتہائی مشکل آرٹ بن چکا ہے جس میں سالہا سال کی شبانہ روز مسلسل محنت کے بعد جاکر کہیں انسان کسی درجہ تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک جان لیوا اور ظالم فن ہے، لیکن جو لوگ ایک دفعہ اس میں کمال حاصل کر لیتے ہیں، وہ اسٹیج پر اس طرح تیرتے ہوئے جاتے ہیں، جیسے مچھلیاں اپنے مانوس پانیوں میں۔ پہلے ہم ایک بیلے کے اسکول میں اُس کی ممتاز پرنسپل مادام گلا کونوا کی دعوت پر گئے۔ یہ خاتون خود بھی کبھی بڑی مشہور رقّاصہ تھی اور ان سے میری پہلی ملاقات ایک جشن کے موقعہ پر ہوئی تھی۔ اس اسکول میں داخلہ کے لیے سینکڑوں اُمیدوار درخواستیں بھیجتے ہیں، لیکن داخلہ بڑا سخت ہے۔ اس سال پرنسپل نے اپنے اسکول کے لیے ایک ہزار اُمیدواروں سے مختلف درجوں کے کل ۴۳ اُمیدوار منتخب کیے تھے۔ جب ہم پہنچے تو چار افسردہ تاریک خنک کمروں میں مُسلسل مشق جاری تھی سب سے چھوٹی کلاس میں نو سال کی عُمر کے بچے تھے، جو فولاد کے ڈنڈے پر اپنی کل کل توڑ رہے تھے اور ابھی اپنے ابتدائی سبق لے رہے تھے۔ درمیانے درجے کی کلاس میں پرنسپل خود تفصیل کے ساتھ نکات سمجھا رہی تھی۔ وہ اپنے ترچھے ہاتھ سے طالبات کے ٹخنوں پر زور زور سے ضرب لگاتی اور اُن کی پنڈلیوں کو مروڑتی تھی۔ میری چھوٹی بیٹی کو بیلے سیکھنے کا عرصہ سے جنون سوار تھا، لیکن اِس سختی اور زدوکوب کو دیکھ کر ان کا بیلے کا جن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔ اسکول کی آخری کلاس میں فنِ رقص کا معیار بہت اُونچا تھا ایک لڑکی نے تو اتنا اچھّا رقص کیا کہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور نام پیدا کرے گی۔ بیلے اسکول کی زندگی بڑی سخت ہے۔ نو سال کی عمر سے لے کر ۱۹ سال کی عُمر تک متواتر مشق کرنا پڑتی ہے، لیکن رُوسی لوگ

مہارتِ خصوصی کو قطعاً تنگ اور محدود نہیں بناتے۔ مثلاً اسی اسکول کی طالبات کو رقص کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین بھی سیکھنے پڑتے ہیں تاکہ اگر وہ زندگی میں کامیاب رقاصائیں نہ بن سکیں، تو اپنی دوسری تعلیم کا سہارا لے لیں۔ اسکول کا کورس مکمّل کرنے کے بعد ان اُمیدواروں کو سالہاسال بیلے کی مشق کرنی پڑتی ہے، جب جاکر یہ سٹیج تک پہنچ پاتی ہیں۔ پہلے وہ اکسٹرا کے طور پر کام کرتی ہیں، جب ان کی قدر و قیمت کا سِکّہ بیٹھ جائے، تو اُنہیں اہم تر کردار دیے جاتے ہیں۔

مَیں نے ماسکو میں تین بیلے دیکھے، جو اس فن کے بہترین نمائندے تھے۔ ان میں ایک تو بخشی سرائے تھا۔ یہ گوگول کی لکھی ہوئی ایک کہانی ہے، جس میں بیلے کے روپ میں ایک رُوسی لڑکی کی لازوال محبّت پیش کی گئی ہے، جس کے محبُوب کو قتل کر کے حملہ آور تاتاری اسے اپنے مشرقی محلّات میں اُٹھا لے جاتے ہیں اور یہ بے مایہ ماہ جبیں اس عشرت گاہ میں اپنے محبوب کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے۔ اس ننّھے سے المیّہ کو اِس نزاکت اور نفاست سے پیش کیا گیا کہ کہیں بھی دل پر گراں نہیں گزرا۔ تاریخی واقعات سب پس منظر میں دکھائے۔ مثلاً تاتاریوں کی افواج کا حملہ اور دشمن کی پسپائی شب سایہ کی صورت میں ادا کی گئی۔

کارسار دُوسرا مشہور بیلے تھا جس میں ایک سمندری لیٹرے کی داستان پیش کی گئی ہے۔ روس کا نمبر ایک رقّاص لی آپا اس میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ لی آپا نہ صرف وجیہہ اور خوش شکل ہے بلکہ اپنے معراجِ فنّ کی وجہ سے دیوتا کی طرح پوجا جاتا ہے۔ عورتیں مرحبا مرحبا چیخ چیخ کر گلے بٹھا لیتی ہیں کئی لخلخے سنگھائے جاتے ہیں۔ واقعہ ہے کہ یہ ظالم بلند ہوا میں اس طرح قلانچیں مارتا اور قلابازیاں کھا کر پھر اپنے پنجوں پر اس

روانی سے واپس آجاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی فضاؤں کا پروردہ ہے یا انسان ہے کہ تیز طرار طیارہ ہے، جو تاروں کو تلملا دے گا، بادلوں کو بوکھلا دے گا۔ بیلے کی ٹیکنیک اس کمال پر پہنچ چکی ہے کہ کارساز میں اسٹیج پر سمندر اُمنڈتا ہے، اس میں ایک بھیانک طوفان برپا ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ پورا جہاز غرق ہوتا نظر آتا ہے۔

سُوان لیک (SWAN LAKE BALLET) بیلے تو رقص کی معراجِ موسیقی کی آخری پہنچ اور حُسن کا اوّلین وجد ہے ۔ یہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھیے ۔ اسے کتنے جنّات نے مُرتّب کیا۔ کتنی پریوں نے ناچا۔ چاٹے کوسکی "TCHAIKOUSKY" ------ کا جنون پائے رقصاں کا فسوں معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور تمام اعضا موسیقی میں تحلیل ہو کر رہ گئے تھے۔ موسیقی صرف زمین پر محیط نہیں تھی بلکہ آسمانی خلائیں اِس سے معمور تھیں۔ شبِ ماہ تاب میں جھلمل جھلمل کرتی جھیل اور نیلے کنول کے کٹورے کھلے ہوئے اور اس کے سامنے ماہ لقا اپسرائیں اپنے مرمریں بازوؤں سے داستانِ عشق سُریلی ہواؤں میں بکھیرتی ہوئی اوجھل ہو جاتیں اور بدبخت شہزادہ اپنے گم گشتہ دل کی جستجو میں آسمان میں زقند لگاتا ہے۔ شیطانی دیو سے ٹکر لیتا ہے اور موت کو للکارتا ہے۔ راہِ فرار کی سنگ بار منزلیں طے کر کے آخر کار حُسن و عشق ہم آغوش ہوتے ہیں اور مست ہو کر فضاؤں میں رقص کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو سفید راج ہنس آبِ رواں پر مدہوش بہے چلے جا رہے ہیں۔ رقص کیا تھا ایک مصوّری تھی۔ موسیقی کے رنگوں سے وہ آسمانوں میں نقش و نگار بنا رہے تھے یہ احساس ہوتا تھا کہ غیبی پردے چاک کر کے وہ زندگی کا آخری مقصد و معنیٰ لوٹ کر واپس انسانیت کو لا کر دے دیں گے۔ جو سُرور مجھے اس بیلے کو دیکھ کر حاصل ہوا اُس کے متعلق کچھ لکھنا کفر ہے۔

سرور ایک ذاتی نشہ ہے جو چار آنے کی افیم سے بھی ہوتا ہے اور چالیس سال کی تپسیا اور تیاگ سے بھی۔ اسے کون بتائے کون پائے۔ روسی پبلک کی "براوہ" (BRAVO) "خروشے" کی کان پھاڑ آوازیں، تالیاں چیخیں گلدستوں کی بوچھاڑ ایک محشرِ حسن تھا، جہاں ناظرین دیوانے ہو گئے تھے۔ تیس منٹ تک کوئی ہل نہیں سکتا تھا۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ہاتھ سُرخ ہو گئے سُوج گئے۔ یہی ہمّت افزائی اور شوق ہے، جس نے روس میں بیلے کو حیاتِ جاوداں دے رکھی ہے۔

رقّاصائیں وہاں بہت خوش قسمت تصوّر کی جاتی ہیں۔ رُوس میں اچھّی رقاصہ کی اُجرت سب سے زیادہ ہے۔ پاؤلووا (PAVLOVA) ماضیِ قریب کی کامیاب ترین رقّاصہ تھی اُسے افسانوی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی قابل جانشین "الانووا" (ULANOVA) چار دفعہ لینن پرائز جیت چکی ہے۔ اب اس کی عمر پچاس کے اُوپر ہے اور وہ اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہے۔ اس کی نوخیز شاگرد ریپن کینا (REPINKINA) اپنے بیسویں سال میں بڑی تیزی سے بیلے کی دُنیا میں اُبھر رہی ہے۔

موسکو میں بیلے کے دو مشہور اسکول ہیں۔ ایک کا نام بالشوئی ------ ہے۔ یہ حکومت کی نمائش گاہ ہے۔ اس عمارت کے سامنے کا حصّہ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے اور اندر سے یہ سُرخ اور سنہرا ہے۔ بیلکینوں اور بُوکسوں کی چھ چھ قطاریں ہیں، جن میں دو ہزار تماشائی سما جاتے ہیں۔ بہترین نشست کا ٹکٹ ۳۲ روبل (سولہ روپیہ) میں ملتا ہے۔ ان ٹکٹوں کی اتنی مانگ ہوتی ہے کہ ان کی خاصی چور بازاری ہوتی ہے۔ ہر ہفتے اس میں پانچ ناٹک اور دو تین بیلے دکھائے

جاتے ہیں۔ روس کے تیّس شہروں کی اپنی بیلے کمپنیاں اور تھیٹر موجود ہیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ بیلے کو نہ صرف روس میں ہمیشہ بلکہ دُنیا جہان میں فروغ حاصل رہے گا، اس لیے کہ اس سے کان آنکھ رُوح سب ہی بیک وقت مسحور ہوتے ہیں۔

—— بیلے کا دُوسرا اسکول اسٹین اسلاوکی (STANISLAVSKY) ہے۔ دراصل یہ نام اس کے بانی اور اوّلین ڈائریکٹر کے نام پر رکھا گیا ہے۔ کلاسیکل بیلے کی جو داستانیں ہیں، یہ اسکول ان کی مختلف توضیحات کرتا ہے اور اسے عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ بیلے ناچ کے ان دو اسکولوں کے درمیان ایک قسم کی صحّت مند رقابت موجود ہے۔ جذبۂ مسابقت کے ماتحت اپنی اپنی جگہ یہ دونوں ہی اپنے آپ میں زیادہ سے زیادہ کشش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رُوس میں عصرِ جدید کے بیلے بھی موجود ہیں۔ موڈرن بیلے کو رُوسی لوگ گنوار پن اور بربرّیت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو نہ صرف اپنے ملک میں پروان نہیں چڑھنے دیتے بلکہ وہ دُوسرے ممالک کو بھی اجازت نہیں دیتے کہ وہ باہر سے لاکر رُوس میں اس کی نمائش کرسکیں۔ رُوسی لوگ اُسے فنِّ زبوں تصوّر کرتے ہیں۔ حال ہی میں البتّہ امریکی بیلے کو پہلی دفعہ آنے کی اجازت ملی ہے۔ بالشویکی حکومت دُنیائے فنون پر سے اپنی طنابیں ڈھیلی کررہی ہے۔

موسکو میں ۳۲ تھیٹر ہیں، جن میں چار بچّوں کے لیے مخصوص ہیں۔ رُوسی تھیٹروں کے پاس ہفتہ میں چار مختلف ڈرامے دکھانے کا سامان اور لوازم مستقل طور پر موجود رہتے ہیں۔ وہاں اب سنسرشپ بہت نرم پڑگئی ہے۔ عوامی تنقید و تبصرہ کا ادارہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ہر ڈرامے وغیرہ کے نفسِ مضمون، ٹیکنیک، معیارِ اداکاری اور انفرادی کردار

پر بحث کریں اور اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعیّن کریں۔

پتلیوں کا تماشا موسکو کی متّنوع کششوں میں سے ایک بڑی کشش ہے ہر روز ہر شو میں ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے اور تماشائی دو سال سے اسّی سال کی عُمر تک کے ہوتے ہیں۔ پتلیوں کی حرکات اور سکنات کا انتظام اسٹیج کے نیچے سے کیا جاتا ہے۔ غیر مرئی تاروں کے ذریعے پُتلے کچھ اس انداز سے اداکاری کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیتے جاگتے انسان ڈرامہ کے کردار ہیں اور یہ نظر کا دھوکا برابر قائم رہتا ہے؛ البتہ جب تماشہ ختم ہوتا ہے اور تالیوں کی تکرار پر رُوسی تماشہ گر اپنے دیوزاد بازو اسٹیج کے نیچے سے باہر نکالتے ہیں تو پُتلیوں کی جسامت کا ان کی جسامت سے خود بخود موازنہ ہو جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ پتلیوں کے جسم کتنے چھوٹے ہیں۔ جب میں موسکو میں پُتلیوں کا ڈراما دیکھ رہی تھی تو میرے نزدیک امریکی سفیر بیٹھا تھا وہ یہ تماشہ دیکھنے تیسری بار آیا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا اور انتہائی محظوظ معلوم ہوتا تھا۔ دراصل ان پُتلیوں کے کھیل میں بہت لطیف سی تنقیدِ زندگی پنہاں ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو پتلیوں کا سارا ڈراما ہی مغربی ممالک کی تفریح کی ایک ہجو تھا۔ تماشے کا شاہ رُخ بھی ایک پُتلا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ اداکاروں کی تمام حرکات و سکنات کی وضاحت کرتا جاتا ہے اور موڈرن آرٹ کے ستاروں کے تصنّع، ابلہ فریبیوں اور پست معیاروں پر چوٹیں کرتا ہے۔ "JAZZ" راک اینڈ رول، ٹیڈی بوائز خاص طور پر اس کے تیرِ تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں۔ سب سے زیادہ دھجیاں تو اُس نے ہالی وڈ کی اڑائی ہیں۔ جس کے فلم عمُوماً حقیقت سے دُور تاریخ کا خاکہ اور مختلف معاشروں کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ان پُتلیوں کے جشن میں لاطینی امریکی نائٹ کلبوں، فرانسیسی

برہنہ رقص، اٹلی کے متلوّن مزاج گویّوں اور امریکی ایکٹروں پر ریشمی رومال میں لپیٹ لپیٹ کر لگائی جاتی ہیں۔

رُوس کی زمین دوز ریلوے (METRO) کے متعلق میں نے بہت کچھ سُن رکھا تھا اس لیے میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اُسے دیکھنے کے لیے وقت ضرور نکالوں گی؛ چنانچہ میں ایک دن ایک بہت بڑے ریلوے اسٹیشن کے قریب موٹر کار سے اُتر گئی اور تین چار اسٹیشنوں تک زمین دوز ریل گاڑی میں سفر کیا۔ یہ میٹرو اسٹیشن فنِّ تعمیر اور حسن و نفاست کا بہترین شاہکار ہے۔ اسٹیشن نہایت صاف شفاف، عریض اور بسیط ہیں۔ بے داغ سنگِ مرمر کے محل ہیں۔ ان میں جا بجا بلّوری جھاڑ فانوس آویزاں ہیں جن کی روشنی زمین دوز اسٹیشن کی تاریکی میں آفتاب کی مانند جلوہ فگن ہے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ یہاں پکنک منانے کو دل چاہ رہا تھا۔ یہ تو نشاط باغ یا شالامار کی طرح جائے تفریح ہے۔ اِسے اُن کاریگروں اور کلرکوں سے یقیناً کوئی نسبت نہیں جو کاغذات کے طومار اُٹھائے، لنچ بکس بغل میں دبائے، رواں دواں نظر آتے ہیں۔ دُنیا کے کسی حصّے میں ایسا شاندار میٹرو اسٹیشن موجود نہیں۔ انگلستان اور امریکہ کے ٹیوب اس کے مقابلہ میں قبرستان یا کال کوٹھڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔ زمین دوز ریل کا کرایہ صرف پچاس کوپک (چار آنے) ہے۔ چاہے فاصلہ کتنا ہی ہو ریل گاڑیاں انتہائی صاف ستھری، بے حد تیز رفتار، ہر ساز و سامان سے پُوری طرح لیس اور بے انتہا آرام دہ ہیں۔ میٹرو حکومت کی طرف سے عوام کو ایک تحفہ ہے، یا یُوں سمجھ لیجیے کہ خوش آئند مستقبل کی پہلی قسط یا بے صبر عوام کے لیے رشوت۔

موسکو میں ایک دعوت کے موقعے پر میری ملاقات ایک نہایت دلچسپ انگریز

سے ہُوئی جو سالہا سال سے موسکو میں ایک غیر مُلکی نامہ نگار کی حیثیت سے مقیم و مُمتاز اور ایک عدد رُوسی بیوی کا مالک تھا۔ اس کے سر کے بال کھچڑی اور اس کی گفتگو پُختہ کار، غیر متعصّب اور علانیہ تھی۔ رُوسی زبان پر عبور رکھتے ہُوئے وہ بعض ایسی انگریزی کُتب کا رُوسی میں ترجمہ کر رہا تھا جن کی بے حد مانگ تھی۔ میری اس سے طویل گفتگو ہُوئی جس میں اپنی ناداں بے صبری سے میں نے اُس پر تابڑ توڑ کئی سوال کر ڈالے۔ وہ بے چارہ اپنے بھاری بھاری سانسوں میں بہت تحمّل سے مُجھے وہاں کے حالات بتاتا رہا۔ اس گفتگو کے دَوران میں مجھ پر منکشف ہُوا کہ رُوس کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اشتراکی سوسائٹی میں کوئی طبقاتی امتیاز موجود نہیں۔ وہاں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے درمیان معاشرتی اور مالی امتیاز نمایاں طور پر موجود ہے اور وہ قطعاً دو طبقوں میں تقسیم ہیں، مثلاً بے ہنر مزدور ۲/۱ ۳ سو روبل اور ہنر مند مزدور سولہ سو روبل ماہوار اُجرت لیتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنسدانوں، پروفیسروں اور موسیقیؔ، ڈراما، بیلے اور دُوسرے فنونِ لطیفہ کے چوٹی کے فنکاروں کو بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں جس سے اُمرا کا ایک طبقہ برقرار رہتا ہے۔ وہاں چوٹی کے موسیقار یا نغمہ ساز (COMPOSER) کو پچیس لاکھ ڈالر سالانہ ملتے ہیں۔ یہی حال دوسرے باکمال فنکاروں کا ہے۔ اس طبقاتی فرق کا مزید عملی ثبوت یہ ہے کہ ان چوٹی کے خاص لوگوں کے پاس اپنے ذاتی رہائشی فلیٹ ہیں اور یہ بات موسکو میں تعیّش خیال کی جاتی ہے۔ دیہات میں ان کی باغیچوں سمیت کوٹھیاں موجود ہیں، جنہیں رُوسی زبان میں ڈاچا کہتے ہیں۔ پھر ان کے پاس اپنی موٹر کار ہوتی ہے اور بنک میں لاکھوں کروڑوں روبل جمع ہوتے ہیں۔ روپیہ ان ممتاز ہستیوں کے پاس بے شمار ہوتا ہے۔

یہ جُدا بات ہے کہ انہیں خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ اس روپیہ سے کیا خریدیں۔ خریدنے کے لیے مارکیٹ میں اتنی متنوّع اشیاء موجود نہیں ہوتیں کہ یہ طبقہ ان سے انتخاب کر سکے۔

اس انگریز سے مجھے یہ دلچسپ خبر بھی ملی کہ رُوس میں بھی تھوڑے سے ٹیڈی بوائز پیدا ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ متعدی بیماری پردۂ آہنی کے اس پار بھی سرایت کر کے لاحق ہو چکی تھی۔ رُوسی زبان میں ٹیڈی بوائز کو "سٹیلاگی" کہتے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ سٹائل کا پیچھا کرنے والا ہے۔ یہ معدودے چند ٹیڈی گل مچھے تھے، تنگی سا لباس پہنے، سارا دن آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے، لیکن رُوسی حکُومت نے ٹیڈی بوائز کا مسئلہ بہت جلدی حل کر لیا ہے۔ اس نے ہر محلّے کے ذی عزّت بزرگوں کو مجسٹریٹی اختیارات دے دیے کہ وہ ہر ٹیڈی بوائے کو عین موقع پر گرفتار کر لیں اور بغیر سماعت کے اُسے پندرہ دن کی قید کی سزا دے کر جیل بھجوا دیں۔ اس انگریز کی رائے میں رُوس کا نوجوان طبقہ بحیثیت مجمُوعی بہت مطمئن ہے، اس لیے کہ نوجوانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے حکُومت نے بہت کچھ کیا ہے۔ رُوس کے بچّے آبادی کا سب سے خوش قسمت حصّہ سمجھے گئے ہیں۔ انہیں ملک و قوم کی آئندہ نسل تسلیم کر کے اور آنے والے کل کی علامت تصوّر کرتے ہُوئے ان کی پیدائش کے وقت سے لے کر ان پر خاص توجّہ کی جاتی ہے، وظیفہ دیا جاتا ہے اور ہر آرام فراہم کیا جاتا ہے۔

میں نے ان بزرگوار سے پُوچھا کہ ۲۰ سال سے آپ کا سابقہ اِن لوگوں سے پڑ رہا ہے، یہ کس قماش کے ہیں۔ کیا رُجحانات اِن کے کردار میں آپ نے پائے ہیں؟ وہ بولے مجھے ایک چیز جو ان میں نمایاں نظر آئی، وہ ہے رنگ و نسل کے

تعصب سے پاکی۔ سیاہ حبشی ہو یا چپٹا منگول، سب کی آؤ بھگت یکساں ہوگی۔ دُوسری خصوصیت ان کی روایت پرستی ہے۔ ان کی جڑیں ماضی میں گڑی ہُوئی ہیں کسی قسم کی موڈرن جدّت کو جلد قبول نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ صدیوں کی خونریزی سے تنگ چُکے ہیں۔ جنگ بالکل نہیں چاہتے۔ ان کی "امن پسندی جنون کی حد تک ہے۔ ان کی ساری قوّت اپنے تعمیراتی اور ترقیاتی منصُوبوں پر مرکوز ہے اور وہ کسی قیمت پر امن بیچنا نہیں چاہتے، عموماً عوام بہت سادہ طبیعت، بے تکلف پُرخلوص دوست دار ہیں۔ ان کی زبان ذراسی سیکھ لو، تو بہت جلد کُھل جاتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی اور جوشِ طبع باہر والوں کو نظر نہیں آتا، لیکن آپس میں یہ لوگ بہت خوش باش اور جذباتی ہیں۔

"آپ خاصے عرصہ سے رُوس میں ہیں، کیا آپ نے یہاں کے افراد میں پہلے کی بہ نسبت کُچھ تبدیلیاں محسوس کی ہیں؟"

جواب ملا کہ سٹالن کے طویل عہد کے بعد جس میں دباؤ اور بندشوں کے سوا کُچھ نہ تھا، اب رُوسی لوگوں کے ہنسی مذاق کی جبلّی حِس پھر بیدار ہو رہی ہے۔ خلوت اور آزادی، نقل و حرکت کے لیے نئی نئی خواہشات غلبہ کر رہی ہیں۔ پریس میں، ادبی کلچرل جرائد میں، افراد اپنے خطوط میں خاصی بے باکی سے تنقید کرتے ہیں۔

"کوموسوموسکایا پراودا" (KOMOSOMOLSKYA PRAVDA)

نوجوانانِ رُوس کے لیے ایک سرکاری اخبار ہے، جس کا مدیر خروشیف کا داماد تھا، جو اب "ازوتیسیا" کا مدیر مقرر ہو گیا ہے۔ یہ اخبار پبلک سے مختلف موضوعات پر سوال کرتا ہے، جس کے جواب میں لاکھوں خطوط آتے ہیں جس کے ذریعے عوامی رُجحانات

کی نبض کا پتہ چلتا ہے، اس کے عملے میں چالیس اراکین دن رات خطوط پڑھ کر مواد کو ترتیب دیتے ہیں۔ حال ہی میں اس اخبار کے قائم شدہ ادارۂ رائے عامّہ (THE INSTITUTE OF PUBLIC OPINION) نے لوگوں سے جواب مانگے کہ تمہاری رائے میں حالات پہلے سے بہتر ہیں یا ابتر۔ ۰، فی صد نے کہا بہتر ہیں، پچیس فی صد نے کہا وہی حال ہے نہ بہتر نہ ابتر۔ پانچ فی صد نے کہا "پہلے سے بدتر۔" اس قسم کی رائے اوّل تو اسٹالن کے عہد میں لی نہیں جا سکتی تھی اور اگر لی بھی جاتی، تو لوگ ڈر کے مارے سو فی صد ایک ہی جواب دیتے کہ حالات بہتر ہیں، بلکہ بہترین ہیں۔

بیگم ہلالی نے میرے لیے ایک شام پارٹی پر موسکو کی چند معزز خواتین کو مدعو کیا۔ موسکو اسٹیج کی ایک مشہور ایکٹرس "باریسوا" جس کے شباب و حُسن نے اُسے اس قدر جاذب بنا دیا تھا کہ نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا، بیلے اسکول کی پرنسپل مادام گلاکونوا، وزارتِ خارجہ کے ڈپٹی منسٹر کی بیگم مادام پشکینا "بالشوئے" بیلے کی ہر دلعزیز رقاصہ دینا گراووا اور مختلف سفیروں کی بیگمات۔ شام بہت اچھی گزری۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گفتگو دیر تک چلتی رہی۔ سب سے زیادہ دلچسپ سوویٹ وِمنز کمیٹی کی چیف، فربہ اندام بوندارینکو تھیں جن سے میں نے کئی سوال کیے۔ وہ اپنی زبان بولتی رہیں اور ہماری زویا ترجمہ کرتی گئی۔ میں نے ان سے سوویٹ یُونین کی عورتوں کے متعلق پُوچھا؛ مادام نے بتایا کہ اگر کسی مُلک میں عورت اپنی پُوری جودت پر آئی ہے تو یہاں پر، اس مُلک میں عورتیں اپنا پُورا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے سارے موقعے انہیں میسّر ہیں۔ رُوسی آئین کے مطابق نظریاتی طور پر

عورت حکومت میں ہر مقام حاصل کر سکتی ہے۔ محض جنس کی بنا پر اس سے تمیز رُوا نہیں رکھی جاتی۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ سپریم سوویٹ میں ۴۸ ۳ ڈپٹی عورتیں ہیں، تمام مُلازمتوں کا ۵۴ فی صد عورتوں کے پاس ہے۔ ہاتھ سے کیے جانے والے کاموں اور تعمیراتی کاموں کی جو اسامیاں ہیں، ان میں سے ۳۰ فی صد پر عورتیں مقرر ہیں۔ مُلک بھر میں دو لاکھ سے اُوپر عورتیں انجنیئر ہیں۔ ۴۱، عورتوں کو سائنس اور آرٹ میں نام پیدا کرنے پر اسٹالن پرائز اور لینن پرائز مل چکے ہیں۔ ان محترمہ سے پتہ چلا کہ عصمت فروشی وہاں بالکل نہیں ہے۔ آج سے لمبا عرصہ پہلے تک طلاق بہت آسان تھی۔ میاں بیوی کسی بھی وقت چھوٹی سی وجہ پر دائمی طور پر جُدا ہو سکتے تھے۔ اب کچھ تحفّظ عود کر آیا ہے اور گرہستی زندگی کو کچھ ثبات حاصل ہو گیا ہے۔ ناجائز اولاد کا تصوّر ہی موجود نہیں ناجائز بچّے کی حفاظت اور دیکھ بھال اتنی ہی کی جاتی ہے جتنی جائز بچّے کی۔

مجھے موسکو، لینن گراڈ جا کر اور وہاں کے حالات کا کچھ کچھ اندازہ لگا کر اور مزا آیا کیونکہ ڈھائی مہینے پہلے ہی میں امریکہ کے مختلف شہروں اور یُونیورسٹیوں کا چکّر کاٹ چکی تھی۔ دونوں حریف معاشرے اپنے اپنے فلسفے، نظام، اپنے اپنے طریقۂ زندگی کے تحت خوب پھل پھُول رہے ہیں۔ رُوس کو البتّہ امریکہ کے معیارِ عیش و آسائش تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا۔ امریکہ کی فراوانئِ مال، سُوپر مارکیٹ، عیش کدے، پچھلے سو سال کی آزاد محنت کا پھل ہیں۔ رُوس کو ابھی ۴۶ سال ہوئے ہیں زاروں کے چُنگل سے چھٹے ہُوئے اور اپنا اقتصادی تجربہ کرتے ہُوئے۔ دونوں کی ترقّی اپنے اپنے متعلقہ کیلنڈر کے حساب سے قابلِ تحسین ہے۔ دونوں طرف ذی ہوش مدبر ہیں۔ اعتدال پسند طبقے میں جو ایک ننھی سی اقلیت پر مشتمل ہے ایک دُوسرے کے لیے دل میں عزّت

اور رواداری ہے، لیکن افسوس کہ دونوں حکومتیں باہمی خوف وخطر سے ایک دوسرے کے لیے، بلکہ ساری انسانی تہذیب کے لیے ہلاکتیں ذخیرہ کر رہی ہیں۔ افسوس کہ دونوں طرف عوام کو شدید نفرت اور حقارت، تعصّب اور بغض کی خوراک پر دن رات پالا جا رہا ہے۔ دونوں مُلکی پریس بیرونی حقائق کو اپنے رنگ میں ڈبو کے پیش کرتے ہیں۔ رُوس تو پھر بھی اشتراکی نظام ہے لیکن جب امریکہ کی آزاد جمہوریّت میں سارے وقت اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن پر ایک ہی قسم کا یکطرفہ مبالغہ آمیز اندھا پرچار ہوتا ہے، تو طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ اگر کل حالات سے مجبور ہو کر اور نیوکلیر جنگ کے امکانات کو سمجھتے ہُوئے، دونوں سیاسی رقیبوں نے معاہدہ امن و دوستی کر لیا، تو اُنہیں ایک نسل لگے گی اُس زہریلے مواد کو نکالتے نکالتے جس کے عوامی ذہن کو باقاعدہ انجکشن ملتے رہتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۰ء کے آخر میں میں نیویارک میں تھی جب U.N.O. کا ہنگامی اور طوفانی اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک مُمتاز امریکی اخبار کی سُرخی تھی۔ دُنیا کے تین بدترین قابلِ نفرت انسان، ناصر، کاسترو اور خروشیف آج پہنچ گئے۔ خروشیف کے فلیٹ کے آگے اِکّا دکّا جتھّے جمع ہو کر اسے باآواز تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتے۔ ایک آوازہ تو میں نے خود سُنا "بڈھے کھوسٹ مر جاؤ"۔ پھر نیویارک میں خروشیف کا ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیکھا۔ ڈیوڈ سکنڈ نے جو ایک مشہور براڈکاسٹر اور کمنٹیٹر ہے، خروشیف سے سوال کرنے شروع کیے۔

"مسٹر خروشیف آپ کی شخصیّت کے دو رُخ ہیں۔ ایک لمحہ میں آپ غرّانے اور پنجے مارنے لگتے ہیں، دُوسرے لمحہ چُومنے چاٹنے پر اُتر آتے ہیں۔ آپ کا کونسا رُخ صحیح سمجھا جائے؟"

خروشیف کو پتہ تھا کہ اُس کی یہ مُلاقات کروڑوں آنکھیں امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں دیکھیں گی، اس لیے اُس نے برہم ہونے کے بجائے مُسکرا کر جواب دیا۔ اگر بلّی کو ٹھوکر مارو گے، تو غرّائے گی اور پچکارو گے، تو چاٹے گی۔" دوسرا سوال:
"آپ کی تقریریں یا تو دھمکیاں ہوتی ہیں یا شیخیاں - کیا آپ چاند پر نہیں بھونک رہے۔"

میرا خیال تھا خروشیف اب اُسے ڈانٹے گا، لیکن وہ شاطر سیاست دان پھر بڑے تدّبر سے بولا:"

" تم میرے بیٹے سے بھی چھوٹے ہو اور تمہارے دعوت نامہ پر میں ایک مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں اور دُنیا کی ایک عظیم طاقت کا نمائندہ ہوں. کیا تمہیں یہ زبان زیب دیتی ہے؟"

ڈیوڈ سکنڈ نے معافی تک نہیں مانگی، پھر اسی طویل انٹرویو کے دوران میں جو ٹیلی ویژن پر دو دو منٹ کے وقفے سے آتے تھے، اس میں رُوس کے خلاف دشنام گوئی اور خروشیف کو رُوسی ریچھ سے تشبیہہ دی جاتی تھی - ابھی انٹرویو چل ہی رہا تھا کہ خروشیف کی پارٹی نے اس کو پرچی لکھ کر بھیجی کہ ٹیلی ویژن پر تمہارے خلاف انٹرٹیشن میں خرافات بک رہے ہیں. خاموشی سے پرچی پڑھ کر خروشیف پھر ڈیوڈ سکنڈ سے ہمکلام ہو گیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی - اِس امریکن ٹیلی ویژن کمپنی کا خیال تھا کہ ہم اس بڈھے کو چڑا کر غصّہ میں لائیں گے اور ایک دفعہ خروشیف طیش میں آجائے، تو جنرل اسمبلی کی طرح جُوتا اُتار کر میز ٹھوکنا شروع کر دے اور ساری دُنیا اس کی اصلیت پا جائے لیکن یہ سب کا اُستاد تھا، برابر مُسکراتا رہا اور بے چارہ ڈیوڈ سکنڈ آخر میں اپنے ناخن چبانے لگا، کیونکہ اس کی ساری چال غلط ہو گئی۔

اِس مشہور انٹرویو کا تجزیہ فوراً اس کے بعد ٹیلی ویژن پر ہوا، تجزیہ کرنے والے امریکہ کے مشہور جرنلسٹ کینیڈا، آسٹریلیا کے نامہ نگار اور کارل شپیرو" تھا جس کا قول سوویٹ یُونین پر حرفِ آخر مانا جاتا ہے۔ امریکی اخبار نویسوں نے تو دبے دبے ڈیوڈ سکنڈ کی پیٹھ ٹھونکی، لیکن کینیڈا اور آسٹریلیا کے نامہ نگاروں نے ڈیوڈ سکنڈ سے کہا کہ یہ سب محض طفلگی تھی، آپ ایک بچّے سے نہیں کھیل رہے تھے جسے ہنسا رُلا سکتے۔" اور امریکی جرنلسٹوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگ خروشیف کا یہ نیم پُختہ نفسیاتی تجزیہ کرنا چھوڑ دیجیے، خروشیف کو اگر سمجھنا ہے، تو مغربی محاورے میں نہیں سمجھ سکتے۔ اس کو اپنے تاریخی اور سیاسی پس منظر کے سامنے رکھ کر سمجھو اور پھر دیکھو کہ اس کا دم بھی بہت غنیمت ہے۔ اگر مغربی طاقتیں کسی قسم کا سمجھوتہ کر سکتی ہیں، تو اس کے زمانے میں۔ اس کی ذات سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیے شاید اس کا جانشین اتنا بھی نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسٹالن کی موت کے آدھ گھنٹہ بعد ہی اسٹالن کی ہر حکمت عملی کے قطعی اُلٹ کام شروع ہو گیا۔ صاف الفاظ میں یوں کہ رُوس کی تمام فضا کا تناؤ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ فروری ۱۹۵۶ء میں خروشیف نے بیسویں کانگریس کے سامنے جو دو تقریریں کیں وہ تقاریر سٹالن کی شخصیت پرستی والے مذہب کا رسمی استرداد تھیں۔ خروشیف نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا۔

۱۔ جنگ تقدیر مبرم کی طرح اٹل نہیں ہے۔

۲۔ خانہ جنگی یا تشدّد کے بغیر بھی سوشلزم پارلیمانی ذرائع سے داخل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ لینن کا یہ اصول کہ سرمایہ داری اور سوشلزم پہلو بہ پہلو رہ سکتے ہیں، محض ایک شاطرانہ چال نہیں تھی، بلکہ رُوسی خارجہ حکمتِ عملی کا ایک بنیادی عقیدہ تھا۔

حال ہی میں خروشیف نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں بلاتعصّب سرمایہ دارانہ نظام سے اچھّی اچھّی باتیں سیکھ لینی چاہئیں۔

پھر خروشیف نے کہانوں پر اسٹالن کی اذیتوں بہیمانہ مظالم اور مجنونانہ قتلِ عام کے مہیب خدوخال بے نقاب کیے۔ خروشیف کے اس واضح اعلان کا یہ فوری اثر ہوا کہ اینٹی اسٹالن مہم یکدم شروع ہوگئی اور اسٹالن کی ہر تصویر ہر جگہ سے اُتار دی گئی "اسٹالن پیس پرائز" کا نام بدل دیا گیا اور اسٹالن کی لاش گمنامی کے سُپرد ہوگئی۔ یہ حقائق خود رُوسیوں کے لیے اور رُوس سے باہر کمیونسٹوں کے لیے حیران کُن انکشافات تھے۔ اس کے بعد رُوس کے ضابطۂ تعزیرات پر نظرِ ثانی کی گئی۔ بعض چھوٹی چھوٹی قانون شکنیوں پر جو انتہائی سخت سزائیں نافذ تھیں اُنہیں نرم کر دیا گیا۔ سیاسی وجوہ کی بنا پر عام گرفتاریاں بند کر دی گئیں۔ لیبر کیمپ تقریباً بند ہو گئے اور جلاوطنی کی سزا سیاسی بنا پر شاذونادر ہی دی جانے لگی، اسٹالن کے عہد میں ہر وزیر کے لیے پولیس کے حفاظتی دستے مقرّر تھے، اب وہ اُڑا دیے گئے، شہری آزادیوں میں خاصا اضافہ کر دیا گیا۔ رُوسیوں کے سفر کرنے پر جو پابندیاں تھیں ہٹا دی گئیں۔ رُوسیوں کو غیر ملکیوں سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی، پریس اور ریڈیو میں مغربی ممالک کے خلاف پروپگنڈا کے اندر شدید قسم کا زہریلا پن ہوا کرتا تھا، اُسے کم کر دیا گیا۔ لہجہ میں متانت شائستگی اور معقولیت آگئی اور سیّاحوں پر رُوس کے دروازے کُھل گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ممالک کے ہزارہا سیّاح رُوس میں آکر لُطف اندوز ہونے لگے۔ موسکو کے اردگرد تیس میل تک اب ہر سیّاح پُوری آزادی کے ساتھ جہاں چاہے آجا سکتا ہے، اس حد سے باہر جانا مقصُود ہو تو حکّام کو صرف اطلاع دے دینا کافی ہے۔ ہاں بعض خاص خاص علاقوں میں جانے کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں رُوس میں پہلی دفعہ یہ اجازت ملی کہ ایک سیّاح پولینڈ کی سرحد سے موسکو تک اور موسکو سے کریمیا تک موٹر لے جا سکتا ہے۔

رُوس کے تازہ اَدب میں بھی آزادانہ اظہارِ خیال کا رُجحان صاف محسوس ہوتا ہے کئی کُتب بیس سال کے مکمل بلیک آؤٹ کے بعد اب جا کر شائع ہوئی ہیں اور لوگوں کو دوبارہ مل رہی ہیں۔ بعض ڈرامے زمانۂ ماضی میں سنسر کی گرفت میں آ گئے تھے اور قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیے گئے تھے اب ان کی بھی اجازت مِل گئی ہے۔ رُوس کا ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس "مایاکووسکی" تھا جس نے خودکُشی کر لی تھی اب اُس کا ڈرامہ "بستر کا کھٹمل" موسکو میں اسٹیج پر دکھایا جا رہا ہے۔ اس میں رُوس کے موجودہ دورِ حکومت کے خلاف لطیف ہجو ہے۔ اِسی طرح ایک دُوسرا ڈرامہ "شہپر" ونگز (WINGS) جو یوکرائن کے ایک ڈرامہ نگار کی تصنیف ہے موسکو میں کھیلا جا رہا ہے۔ اس ڈرامہ کا مرکزی خیال ہی خُفیہ پولیس کے خلاف ہے، پھر اسی طرح اب سائنس بھی پہلے کی طرح سخت غیر لچکدار نہیں رہی۔ سوشیولوجی، جو بوژوہ خیالی پلاؤ قرار دے کر رد کر دی گئی، از سرِ نو تسلیم کی جا رہی ہے، حکومت اور ٹریڈ یُونین دونوں اپنے اپنے ریسرچ کے مرکز چلا رہی ہیں۔ علم النفسیات میں بھی لکیر کے فقیر ماہرین اپنے فلسفوں کو حالاتِ نو کے سامنے بدلتے دیکھ رہے ہیں۔ فرائیڈ اور اس جیسے دُوسرے مفکّرین کے خلاف رُوس میں جو تعصّب تھا وہ رفتہ رفتہ مِٹتا جا رہا ہے، مقبول عام مغربی موسیقی "جیز" اور یورپی فلمیں بھی رُوس میں قبول کی جا رہی ہیں۔ وہاں کے عوام کو لازمی طور پر پہلے سے زیادہ آزادی دی جا چکی ہے۔

یہ رہا وہ مُلک جس کی جغرافیائی وسعت غیر محدود ہے۔ لمبائی کی طرف سے اسے

عبور کرنے میں سورج کو گیارہ گھنٹے لگتے ہیں، اس کے شمال اور جنوب کے موسم میں اتنا اختلاف ہے کہ جس وقت سائبیریا میں پارہ اسّی درجہ تحت صفر ہوتا ہے تو بحرِ اسود کے کنارے لوگ کھلے نہار ہے ہوتے ہیں۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے تین گنا بڑا ہے اور کرّہ ارض کے تمام رقبہ کا چھٹا حصّہ ہے۔ یہ پندرہ ریپبلکوں پر مشتمل ملک مغرب کی پہلی سوشلسٹ سلطنت ہے اور امسال اپنی ۵۰ ویں سالگرہ منا رہی ہے، کسی نے خوب جملہ چست کیا ہے کہ اس کا سیاسی اثر ساٹھ مربع انچ فی گھنٹہ کے حساب سے پھیلتا جا رہا ہے، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ، ہنگری، البانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، مشرقی جرمنی، چین، منگولیا، شمالی کوریا۔ ویٹ نام کے لیے یہ ایک فلسفۂ ایک طریقِ زندگی پیش کرتا ہے۔ اس میں ساٹھ اقوام آباد ہیں۔ جن میں ۲۵ فی صد غیر سلاو (NON SLAV) ---- بیس فیصد غیر سفید آبادی اور اڑھائی کروڑ مسلمان ہیں۔ یہودی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔

اس قوم کی تاریخ پر سرسری نظر دوڑا کر یہ اندازہ ہوا کہ اس قوم سے زیادہ تیرہ بخت قوم صفحۂ ہستی پر کبھی نمودار نہیں ہوئی، اس کے مظلوم عوام نے کبھی عدل و مساوات امن و اطمینان نہیں دیکھا۔ تاریخ انسانی میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کی رعایا نے تاریک دَور کے بعد زرّیں عہد نہ دیکھے ہوں، قوموں کی داستان نصیب و کردار کا ایک تصادم رہا ہے کبھی اقبال بلند کبھی پست۔ آواگون کے چکّر کی طرح کبھی موت کبھی زیست، ہندوستان کے باشندوں نے اگر نادر اور تیمور کی ہلاکتیں دیکھیں، تو سمراٹھ، اشوک، سمندر گپت، شیر شاہ سوری، فیروز شاہ تغلق کے فراخ زمانے اور عہدِ اکبری اور جہانگیری بھی دیکھے۔ انگلستانیوں نے ملکہ الزبتھ اور وکٹوریہ کے سنہری دَور دیکھے،

لیکن رُوسی عوام نے کبھی آزادی اور فارغ البالی نہ دیکھی۔ اس کے شہنشاہوں نے معرکہ آرا جنگیں جیتیں، پُر جلال قصر اور قلعے بنائے، گرجے کھڑے کیے، خزانے بھرے لیکن رعیت محکوم اور محروم ہی رہی، جب ان کی سیاہ بختی نے بیسویں صدی میں آن کر کروٹ بدلی اور ان کی اقتصادیات بحال ہُوئیں، تو ساتھ ہی "اسٹالن ازم" شروع ہو گیا جس کے ظلم کے سامنے ہلاکو اور چنگیز شیر خوار بچّے معلوم ہوتے تھے، لوگوں کو ہر مالی امداد اور سوشل تحفّظ مِلا ہے، بیروزگاری، بیماری، بے علمی اور بے مائیگی سے نجات ملی مگر آزادی پھر بھی نہ ملی؛ البتّہ اب چند سال سے مقابلتاً پہلے کے عوام نے ذرا آزادی کا سانس لیا ہے اور اگر اس کے ترقّیاتی منصُوبے کامیاب ہوتے چلے گئے اور دونوں اطراف نے سرد جنگ کا خاتمہ کر کے پہلو بہ پہلو زیست سیکھ لی تو رُوسی عوام کو دُوسرے ملکوں کی طرح بہت کچھ آزادی مل جائے گی۔

یہ قوم مستقبل میں اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالے گی؟ نوعِ انسان کی ڈرامائی تقدیر میں یہ کیا کردار ادا کرے گی؟ اس کے اقتصادی نشانے کہاں تک خطا ہوں گے؟ اس کے عالمگیری خواب کس حد تک شرمندہ تعبیر ہوں گے؟ یہ عوام کو کتنی موعودہ نجات دلا سکے گی؟ سوشل اِزم کو سرمایہ داری کے پہلو بہ پہلو قائم رکھنے اور سوشل اِزم پھیلانے کے لیے یہ کون سے خطوط وضع کرے گی؟ یہ سیاسی پیشین گو جانیں یا غیب دان! ان کا جواب صرف مستقبل ہی دے سکے گا۔

لینن گراڈ

"آپ لینن گراڈ دیکھے بغیر پاکستان واپس کیسے جا سکتی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دلّی جائیں اور آگرہ نہ دیکھیں۔" میرے میزبان آغا ہلالی نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہُوئے کہا:

"آپ امریکہ اور یورپ کے بہترین معاشرتی مراکز دیکھ کر آ رہی ہیں۔ آپ کو تو خاص طور پر وہاں جانا چاہیے اور کچھ نہیں تو برائے موازنہ ہی سہی۔" میں خاموشی سے اپنے میزبان کا منہ تک رہی تھی۔ خواہش تو مجھے بھی لینن گراڈ دیکھنے کی بہت تھی، مگر بیشتر اس کے کہ میں کچھ جواب دیتی میرے میزبان نے میری خاموشی کو میری بد ذوقی پر محمول کیا۔ وہ پھر ناصحانہ انداز میں بولے:

"لینن گراڈ رُوس کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اس کے ماضی اور حال کی تہذیب اور تمدّن کا گہوارہ۔ اگر آپ وہاں نہ گئیں، تو ہماری مہمان نوازی میں بٹّہ لگ جائے گا۔ میں آپ کے شوہر کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔"

مجھے ان کے خلوص اور گرم جوشی پہ بے اختیار پیار آ گیا، اور میں ہنس دی۔ میری ہنسی میرے آنسوؤں کی طرح ہمیشہ بے تُکے موقعوں پر نکلتی ہے۔ آغا ہلالی اُدر بھڑکے، وہ سمجھے میں ان کی باتوں کو مبالغہ سمجھ رہی ہوں۔ "حضور اگر آپ نے لینن گراڈ

کا میوزیم "HERMITAGE" نہ دیکھا تو دُنیا میں کچھ نہ دیکھا۔" میں نے اُن کو یقین دلایا کہ خانہ بدوشی میرے خون میں سرایت کر چکی ہے۔ مجھے بھی سیاحت کا اتنا جنون ہے جتنا مارکو پولو یا سندباد کو تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی واپسی کے متعلق فکر مند ہوں۔ موسکو کا ہوائی اڈہ دُھند کے بادلوں میں ڈھکا ہوا ہے اور میں لینن گراڈ جا کر پھنسنا نہیں چاہتی۔"

"یہ سب آپ کچھ خدا پر اور باقی مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں سب انتظام کر لوں گا۔"

تجربے نے سکھا رکھا تھا کہ زندگی کی نعمتیں ہمیشہ زبردستی مجھ پر عاید ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ لینن گراڈ کا عطیہ مجھ پر نازل ہو کر رہا اور میں نے اپنا سر جھکا دیا۔ میرے میزبان نے سوویٹ یونین کی بہترین ریل گاڑی میں سیٹ اور بہترین ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا۔ اور میرے لیے دو عمدہ ہمراہی مقرر کر دیے اور وہ ہمراہی کون؟ ایک تو اُن کی "نصف بہتر" بیگم ہلالی اور دوسری ان کی روسی سیکرٹری زویا جو اپنی اُردو اور انگریزی کے سہارے نہایت دلچسپ ساتھی اور کارآمد رہبر ثابت ہو چکی تھی۔

میرے فیاض میزبان نے میری دونوں بیٹیوں سے وعدہ کیا کہ وہ میری غیر موجودگی میں انہیں خوب سیر کرائیں گے اور بیلے سینما دکھائیں گے۔ یہ رشوت خوب کام آگئی اور میری رہائی آسان ہو گئی۔ رشوت موسکو میں بھی چل سکتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بہت مزے لیے۔

زویا بے انتہا خوش تھی۔ اس کی دیرینہ تمنا بر آئی تھی۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے وہ آج تک لینن گراڈ نہیں دیکھ سکی تھی۔ یہ موقع تو خدا نے اُسے چھپّر پھاڑ کر دیا تھا کہ ڈیوٹی کے سلسلہ میں سیر بھی ہو گئی۔ اس کی صورت دیکھنے والی تھی۔ چہرہ لال بھبُوکا۔

مسرت کے آنسوؤں سے جھلملاتی لرزاں آنکھیں۔ جب تک ہم روانہ نہیں ہوئے وہ سارا وقت "انشاء اللہ" کا ورد بلند آواز سے کرتی رہی۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی بد روح ہمارے پروگرام میں خلل نہ ڈال دے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ زویا نے یہ لفظ "انشاء اللہ" اپنے سفارتخانہ کے ایک پچھلے مہمان راجہ غضنفر علی خاں سے سیکھا تھا۔ راجہ صاحب موسکو میں باقاعدہ نماز پڑھتے تھے اور زویا بڑے غور سے انہیں اُٹھتے بیٹھتے اور جھکتے دیکھتی تھی۔ ایک دن اُن سے پُوچھنے لگی کہ آپ کس کے سامنے بیٹھکیں لگا رہے ہیں؟ راجہ صاحب نے کہا "خدا کے"۔ "خدا کیا چیز ہے؟" زویا نے پُوچھا۔ راجہ صاحب چکرائے اور جو کچھ بچپن سے سُنتے آئے تھے، دہرا دیا کہ "وہ کیا چیز ہے"۔ زویا نے سمجھا یا نہ سمجھا یا سمجھا تو کیا سمجھا۔ بہر حال راجہ صاحب سے ایک کلمہ ضرور سیکھ لیا اور یہ تھا "انشاء اللہ"۔ راجہ صاحب تو چلے گئے، لیکن ان کا نام اس کے ذہن میں انشاء اللہ کے ساتھ منسلک ہو گیا اور اب زویا ہر موقع بے موقع "انشاء اللہ راجہ صاحب" اپنے گاڑھے رُوسی لہجے میں اس طرح کہتی تھی کہ بیگم ہلالی اور میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اس کٹر کمیونسٹ کے مُنہ سے قرأت کے ساتھ "انشاء اللہ راجہ صاحب" سُن کر ہم کو بہت لُطف آتا تھا۔ اس آڑے وقت پر زویا نے اِنہی الفاظ کی رَٹ لگا رکھی تھی۔ بھاگی بھاگی گھبرائی گھبرائی انتظامات کرتی پھر رہی تھی اور مُنہ ہی مُنہ میں بُڑبُڑاتی جا رہی تھی۔ قریب جا کر سُنا تو انشاء اللہ کی تسبیح ہو رہی تھی۔ خیر اُس کا اس لفظ پر ایک نومسلم کی طرح ایمان تھا۔ ہم کافروں نے بھی کمر کس لی۔

اس سرد ابر آلود رات کی سیاہ خاموشی میں ہم تین ادنیٰ گٹھڑیاں موسکو اسٹیشن پر لڑھکتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ ہمارے مُنہ سے اتنی ہی بھاپ نکل رہی تھی جتنی کہ ریل

کے انجن سے۔ اسٹیشن ویران تھا۔ مجھے ٹالسٹائی کی ہیروئن "اینا کرنینا" کی خودکشی یاد آگئی اور دو مزید جھرجھریاں آگئیں۔ یہ ریل سُرخ تیر کہلاتی ہے اور رُوس کی تیز گام ہے۔ اس ٹرین کے بیشتر پُرزے اور لوازمات ہٹلر کی سپیشل ٹرین سے اتار کر لگائے گئے تھے۔ ریل میں خوب چہل پہل تھی۔ مسافر بڑے آرام سے اپنے کشادہ ڈبوں میں براجمان تھے۔ ڈبے صرف دو سیٹوں کے تھے۔ میں اور بیگم ہلالی ایک میں مزے سے لیٹ گئے۔ رُوس میں زنانہ ڈبہ مخصوص نہیں ہوتا۔ زویا غریب کو بڑی اُلجھن ہوئی جب اُسے معلوم ہوا کہ ساری رات ایک اجنبی مَرد کے ساتھ گزارنی ہوگی۔ ہم نے دعائیں مانگیں "کہ یا اللہ اُس کا نیکوں سے پالا ڈالیو۔" "اللہ بچاری زویا کی رات آسان کیجیو۔" پھر ہم نے زویا کو خُوب چھیڑا۔ اس غریب نے چڑ کر اعتراف کیا کہ یہ مخلوط طریقۂ سفر نہ صرف دونوں جنسوں کے لیے باعثِ زحمت ہے، بلکہ ایک جنس کے لیے تو باعثِ دہشت بھی ہے۔ کمپارٹمنٹ میں ایک خود رَو قسم کا لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا، جو نہایت پُرخراش ٹیپ کے سُروں میں پہلے سرکاری وعظ کرتا رہا پھر لوک گیت الاپنے لگا۔ رات کے بارہ بجے ہم تھکے ہوئے اور ریلوائی ریڈیو سر پر چڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ اپنا گلا پھاڑ پھاڑ کر ہمارے کان کے پَردے پھاڑ رہا تھا۔ اس کا مُنہ کیسے بند کریں، گلا کیسے ٹیپیں؟ جل جل کر کروٹیں بدلتے رہے اور کُڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ خود خاموش ہوگیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لیمپ کے پاس ایک چھوٹا سا بٹن لگا ہوا تھا جس کے ذریعہ ہم شور سے نجات پا سکتے تھے۔ اب نیند کی نیّت خراب ہو چکی تھی، کسی طرح ہتھے نہ چڑھی آخر میں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کھڑکی کا پردہ اُٹھایا۔ باہر ایک ٹھٹھرے ہوئے چاند کی سرد سرد مہتابیاں چاروں طرف برف کی سفید وسعتیں اس پر سیاہ جنگل کی گھنی سازشیں

اور ابدی خاموشی ہماری چھوٹی سی ریل گاڑی ایک بھری دیوانی کی طرح چیختی، رات کا مُنہ نوچتی، چھلانگیں مارتی جا رہی تھی۔ صنوبر کے درخت چنکبرے زیبروں کی طرح اپنی لمبی لمبی گردنیں اُٹھائے ہمارے ڈبے کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ جو تھک جاتے تھے وہ پیچھے رہ جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوشش کی کہ رُوسی ریچھ نظر پڑ جائے، مگر ایک بھی نہ دکھائی دیا۔ غالباً وہ ریل کی پٹڑیوں، بٹیوں سے دُور انسانی آبادی سے دُور اپنی دُنیا میں آباد تھے۔ "جونم سو جاؤ اب" بیگم ہلالی کی آواز آئی۔

تقریباً تین سو میل طے کر کے آٹھ گھنٹوں میں ہم لینن گراڈ پہنچ گئے۔ زویا بہت سویرے سے جاگ رہی تھی، چنانچہ بے خوابی اور مسلسل اضطراب سے اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ اپنے لمبے رُوسی سگریٹ نہار مُنہ پیتی ہوئی جلد جلد تیار ہو رہی تھی۔ "انشاء اللہ" نے آخر اسے منزلِ مقصود پر پہنچا ہی دیا۔ لینن گراڈ کی صُبح کچھ عجیب سی تھی۔ گیلی گیلی مٹگجی، کُہر اور دھوئیں سے بھری ہوئی (یہ شہر دُخان آلود کُہر کے لیے مشہور ہے) ہوٹل تک راستہ بھی بڑا مایوس کن تھا۔ اوّل تو اُس دُھند میں نظر ہی کیا آتا، بازار سوئے ہوئے تھے۔ کچھ عمارات شکستہ، سیم خوردہ اور موسم زدہ، کچھ ہم نیم خوابیدہ۔ ہوٹل میں اُتر کر سُستی اُتاری اور ناشتہ کیا۔ ہوٹل بہت شاندار تھا۔ کافی نہایت لذیذ اور کافی پیش کرنے والی کوہ قاف کی ایک جوان سال گلبدن تھی۔ رُوس میں جہاں نسوانی حُسن نظر آئے سمجھ لو کہ کوہ قاف کی درآمد ہے۔ سو اَب میں لینن گراڈ میں بیٹھی تھی جسے رُوس کا دُرِ اسود کہا جاتا ہے۔ عدد و شمار کی رُو سے اِس کا ملک بھر میں دُوسرا نمبر ہے لیکن اہلِ نظر حُسن کے اعتبار سے اس کو پہلا نمبر دیتے ہیں۔ جب اس کی بُنیاد رکھی گئی تھی

تو اس کے نقش و نگار اس طرح ترتیب دیے گئے تھے کہ آج منظم زیبائش و رعنائی میں یہ شہر سب سے پیش پیش ہے۔ اسے رُوس کا وِینس (VENICE) بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے نیچے بے شمار نہروں کا جال بچھا ہوا ہے جن پر چار سو پُل بنے ہوئے ہیں۔ یہ تقریباً سو جزیروں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ دریائے نیوا نین اس کے سینہ پر لوٹتا رہتا ہے، اور اس دریا کا حُسن اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس کا جغرافیہ۔ لینن گراڈ رُوس کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اسی لیے یہ باب بحرِ منجمد شمالی کہلاتا ہے۔ یہ بہت بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز بھی ہے۔ دُنیا کا سب سے پہلا اور تنہا "ATOMIC ICE BREAKER' بھی یہیں نصب کیا گیا ہے۔ روسیوں نے بے برگ و گیاہ صحراؤں کو نخلستانوں میں تبدیل کر لیا ہے اور اب ان کی کوشش ہے کہ وہ شمال کی بیکراں بانجھ برفوں کی گودوں کو بھی ہرا بھرا کر دیں۔

چینی باسن (PORCELAIN) کا سب سے بڑا کارخانہ اور فولاد ڈھالنے کے بھی بڑے بڑے کارخانے جہاں ریل گاڑیاں بھی بنتی ہیں، یہیں ہیں۔ یورپ کا سب سے شاندار ربڑ پلانٹ بھی یہیں ہے۔ رُوس کی زیادہ تر بجلی کی اشیاء یہیں پر تیار ہوتی ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران عرصۂ دراز تک یہ شہر محصور رہا اور ہزار ہا روسی اس کی مدافعت کرتے ہوئے مارے گئے۔ جرمن اس کے قریب دو ڈھائی میل تک پہنچ کر اسے ختم تو نہ کر سکے مگر اپنی بربریت کے نشان چھوڑ گئے۔ جو اب بھی بدنما داغوں کی طرح کہیں کہیں اُبھر آتے ہیں۔

سب سے حیرت انگیز چیز جو میں نے یہاں دیکھی وہ اس بالشویک خطۂ زمین

ہیں شاہی تہذیب کی جھلک تھی جو اب بھی کہیں نہ کہیں نظر آجاتی ہے۔ عین جس طرح ہمارے مُلک میں کہیں کہیں نوابی ٹھاٹھ اور شاہانہ ادائیں آثارِ قدیمہ کی صُورت دکھائی دے جاتی ہیں۔ حکومت گئی، عزّت گئی، دولت گئی مگر آن نہ گئی۔ کچھ اسی قسم کی وضعداری لینن گراڈ میں بھی نظر آتی ہے۔

دو سال تک یہ شہر زبردست مطلق العنان زاروں کا دارالسلطنت اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس کی بوڑھی آنکھوں نے کتنے ہی تغیرّات اور انقلابات دیکھے ہیں۔ پیٹرِ اعظم کا طنطنہ اور دبدبہ کیتھرین اعظم کی سطوت، الگزینڈر کی حشمت، بادشاہوں کی مہربانیاں اور قہر بانیاں، شکستوں کے غم اور فتح کی شادمانیاں۔ ہر گزرنے والی صدی اپنی یادگار اس کے سینے پر چھوڑتی گئی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے اوائل میں پلک جھپکتے ہی شہنشاہیت ختم ہوگئی اور ایک نئے انقلابی دَور نے جنم لیا، لیکن عہدِ رفتہ کے مدھم مدھم نقوش ابھی تک باقی ہیں۔ مجھے ایک دن ایک معمّر خاتون جن کی عمر ستّر سال کے لگ بھگ ہوگی پارک میں سیر کرتی ہوئی ملیں۔ اُن کے لباس و وقار اور نقش و نگار سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی اعلیٰ خاندان کی ہیں، اور اچھّے دن دیکھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر مُسکرائیں اور قریب آکر رُکتی رُکتی انگریزی میں کہنے لگیں۔ "کیسا لگا۔" میں نے کہا:

"آپ کا لینن گراڈ تو دل میں گھر کر گیا ہے۔"

وہ بولیں: "تم لوگ اِسے لینن گراڈ کہتے ہو، مگر میں مر کر بھی اسے اس نام سے نہیں پُکار سکتی۔ میرے لیے یہ پیٹرز برگ تھا اور ہمیشہ پیٹرز برگ رہے گا۔ ذرا چاروں طرف نظر دوڑاؤ اور دیکھو کیا ایک ایک اینٹ پر پیٹرِ اعظم کا نام کندہ نہیں

ہے ؟ یہ زمانۂ حال کے ناشائستہ اور ناتراشیدہ لوگ اس کی قدر کیا جانیں ۔" یہ کہہ کر وہ اچانک تیزی سے دُوسری سمت روانہ ہوگئی۔ میرا خیال ہے اس نے زویا کو آتے دیکھ لیا تھا۔

موسکو کے مقابلہ میں اس شہر کی فضا پُرسکون معلوم ہوتی ہے وہ افراتفری اور ہجومی سیلاب کم تھے۔ لوگ زیادہ با اخلاق ہیں۔ عام لباس بھی مقابلتاً بہتر نظر آیا۔ عورتیں تو یقینی طور پر زیادہ سمارٹ اور سجی بنی دکھائی دیں۔ یہ شہر اپنی گمبھیرتا، نکھار اور جاذبیت میں منفرد ہے۔ اس کے ذوقِ سلیم کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ اس میں ۵۲ کالج اور سات سو لائبریریاں اور ۴۷ عجائب گھر ہیں۔ تمام شہر پر علمی اور ادبی ماحول چھایا ہوا ہے۔ فکر و نظر کی نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ مجھے وہاں محسوس ہوا کہ لینن گراڈ اور موسکو کی آپس میں چشمک زنی ہے جس طرح آسٹریلیا کے سڈنی اور ملبورن میں یا کینیڈا کے کیوبک اور آٹووا میں۔ "لینن گراڈ" کے باشندوں کو اپنے برتر معاشرہ پر گھمنڈ ہے۔ وہ اپنے کو خاندانی، اعلیٰ ہڈی بوٹی والے اور موسکو والوں کو بناسپتی مال اور "نودولتیا" سمجھتے ہیں۔ موسکو والے لینن گراڈ کو رنگین بیوہ کہتے ہیں۔ جس کا سرکاری سُہاگ تو اُجڑ گیا۔ لیکن وہ اب بھی عشوہ و ادا میں حقیقتِ حال سے بے خبر اپنے آپ میں مست ہے۔

ایک اَبر آلود صبح کو ہم ان کا مشہور مرکزی چوک دیکھنے گئے جو پیرس کے (CONCORDE) کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس کے وسط میں پیٹرِ اعظم کا گھوڑے پر سوار مجسمہ ہے، جو ایک فرانسیسی فنکار نے تانبے میں ڈھالا ہے اور --- (THE BROWZE HORSE MAN) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجسمہ لینن گراڈ کی

روح کا ترجمان ہے۔

یہاں ہم سینٹ آئزک کا شاندار گرجا دیکھنے گئے (St. ISSACS — CATHEDRAL) — اس کے کلس سنہری اور گنبد بہت اُونچا ہے۔ ہم ہانپتے کانپتے مینار پر چڑھ گئے۔ یہاں سے تمام شہر اپنے گوناگوں رنگوں میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اندر کی سجاوٹ بہت قیمتی اور نایاب ہے۔ دیواروں پر مصوّروں نے حضرت عیسٰی اور حضرت مریمؑ کی قدِ آدم تصاویر میں رنگ آمیزی کی ہے۔ چھتوں پر بائبل کے قصّوں اور حکایات کو فنکار نے نقاشی کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ گرجا چالیس سال کے عرصۂ دراز میں تیّار ہوا تھا۔ صدیوں سے اِسی خانۂ خدا میں عقیدتمند دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اِرادت کے پھُول چڑھاتے اور خاموش عبادت میں کھو جاتے تھے اور اب یہی کلیسا سیّاحوں کے لیے ایک ہنگامہ زار عجائب گھر ہے۔ جس میں سیّاحوں کی چہل پہل، گائیڈ پر سوالات کی بوچھاڑ۔ باہمی مناظروں اور مُباحثوں نے صدیوں کا مقدّس سکُوت توڑ دیا ہے۔ مذہب بھی عجیب شے ہے۔ مانو تو ٹھاکر نہ مانو تو پتّھر۔ رُوس میں ہزارہا گرجے، عجائب گھر بنا دیے گئے یا توڑ کر اور کسی قومی مصرف میں لائے گئے ہیں اور جو گرجے بچ گئے، وہ بھی خالی پڑے ہیں۔ اتوار کو کچھ نیم مُردہ عبادت ہوتی ہے جس میں زیادہ تر ساٹھ سال سے اُوپر کے بزرگوار دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں سے اکثر تو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ نئی پود اور منجھلی نسل سرے سے غائب، لیکن ہم اوروں کو کیا کہیں ہمارے ہاں بھی تو ؎

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

جب سُورج کی تھرکتی ہوئی کرنیں لینن گراڈ کو چھُوتی ہیں تو اُس کی گُوناگُونی اور بوقلمونی نمایاں ہو کر اُبھرتی ہے۔ ونٹر پیلیس کا رنگ ہریالہ آبی ہے۔ کیروو تھیٹر (KIROV) انگُوری ہے۔ بحری فوج کی عمارات سرسوں کی طرح بسنتی۔ گرجوں کے گنبد آفتابوں کی طرح طلائی، ہر عمارت کا رنگ جُدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوسِ قزح نے اپنے رنگ سمیٹ کر اس شہر کے خمیر میں گُندھوا دیے ہیں اور سب سے زیادہ دِلربا پگھلے سیسے کی طرح چمکتا ہوا دریائے نیوا ہے جو موسم کی طویل مدہوش کُن نیند میں خوابوں کے لالہ زاروں سے گُزرتا ہوا بیتے دنوں کی یادیں پٹے ہوئے پاؤں پسارے دراز ہے۔ اگر صرف محلّات کو ہی مدِّنظر رکھیں، تو ان کی پُرشکوہ آب و تاب نے لینن گراڈ کو بقائے دوام بخش دی ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں کسی شہنشاہ کو زارانِ رُوسی جیتنا اقتدار و اختیار حاصل نہ تھا۔ ایران کے شہنشاہ، ترکی کے سُلطان، فرانس کے بوربوں، ہندوستان کے مغلِ اعظم سب اس کے سامنے ہیچ تھے۔ رُوس کے خزانے دَولت سے بھرپُور رہتے تھے اور رُوس کے زاروں نے یکے بعد دیگرے اپنے محلوں کی تکمیل۔ آرائش اور زیبائش پر بے پناہ دولت صرف کی تھی۔ اِسی لیے دُنیا میں ان محلوں کا جواب نہیں۔ ہر زار نے اپنے عہدِ زرّیں میں لینن گراڈ کی شان و شوکت میں اضافہ اور اس کے حُسن کو دوبالا کیا۔ موسمِ گرما کے محل جو بڑے بڑے خُوشنما باغوں میں گھِرے ہوئے ہیں صفائی کا بہترین نمونہ ہیں۔

پیٹرحوف محل (PETOR HOF) پیرس کے ایوانِ وارسائی سے مشابہت رکھتا ہے اور اسی طرح نادر اور نایاب صنعت و فنون سے آراستہ اور پیراستہ، بوسوپوف محل، جہاں رُوس کا پُراسرار شیطان فطرت جنونی راہب راسپوٹین قتل ہوا

تھا، اپنا جداگانہ پُر ہیبت ماحول رکھتا ہے۔

لینن گراڈ کی تاریخ درحقیقت پیٹر اعظم کی تاریخ ہے اور ایک کا ذکر کرنا اور دُوسرے کا نہ کرنا گویا جسم و رُوح کا جُدا کرنا ہے۔ پیٹرِ اعظم لینن گراڈ کا خالق بھی تھا اور روحِ رواں بھی۔ یہ سات فٹ لمبا لحیم شحیم شہنشاہ مطلق ایک بے رحم ترقی پسند اور متلوّن مزاج شخصیّت کا مالک تھا۔ اس کی ہمہ رنگی ضرب المثل بن چکی ہے۔ گُوناگُوں فنون کے جن اُس نے تابع کر رکھے تھے۔ جس علم پر ہاتھ ڈالتا تھا اُسے پُوری طرح قابو کر کے چھوڑتا تھا۔ اِس دیوزاد نے اپنی سیاستدانی اور فہم و ذکا اور حیوانی طاقت سے قرنہائے قدیم کی جہالت اور پسماندگی کے تاریک غاروں سے اپنی وحشی قوم کو باہر نکال کر اٹھارویں صدی کے مغرب جدید سے آشنا کیا اور اپنی ۴۲ سالہ حکومت میں رُوس کو ایک موڈرن طاقت ثابت کر کے تاریخ یورپ کا رُخ پلٹ دیا۔ اس پیکرِ اعظم نے نے انگلستان جاکر اپنے ذہن کے اُفق کو وسعت دی۔ اس کی ہمہ رنگی کی ایک ننھّی سی مثال یہ ہے کہ لندن میں بیٹھ کر پیٹر اعظم نے مندرجہ ذیل علوم و فنون حاصل کیے۔ علمِ جہازرانی اور جہاز سازی۔ علم نجوم۔ دندان سازی۔ فنِ زرگری و سپہ گری۔ اقتصادیات۔ علم الاعضا۔ تھیٹر۔ سرجری۔ مصوّری۔ سنگ تراشی۔ حکمت اور ڈاکٹری۔ یہ من موجی شہنشاہ اپنے جُوتے خود بنایا کرتا تھا۔ اپنی میز کرُسی خُود تراشتا تھا۔ اپنے محل کے لیے ایک ہاتھی دانت کا فانوس خود ہزار جتن سے تیار کیا۔ اس سنگ دل خُونی زار نے اپنے سگے بیٹے کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ضعیفی میں اپنی کنیز سے شادی کی اور اپنے آخری دنوں میں دریا میں ڈوبتے ہوئے کچھ سپاہیوں کو بچاتے ہُوئے نمونیہ کا شکار ہو گیا۔ پیٹر اعظم نے مملکت رُوس کو مدرسے دیے، حروفِ ابجد دیے، قانون دیا، ٹیکس کے

ضوابط دیے (اُس نے داڑھیوں پر بھی ٹیکس لگا دیا تھا تاکہ لوگ قدامت پسندی کو چھوڑ دیں) بھاری صنعت دی، فوج دی، بحری بیڑہ دیا، لینن گراڈ دیا اور موڈرن یورپ کی تہذیب دی۔ یہ وہ ہمہ گیر شخصیت تھی جس کی مقناطیسی یاد لینن گراڈ کے ہر گوشے اور محراب سے چسپاں ہے۔

لینن گراڈ کو اپنے تھیٹر، ادب اور موسیقی پر بہت ناز ہے اور بجا ناز ہے یہ یقیناً رُوس کے کلاسیکی فن اور ادب کا گہوارہ ہے، اس کے ۱۸ حکومتی تھیٹر، جن میں سے دو کیرو اور پشکن (KEROV & PUSHKIN) تھیٹر خاص طور پر مشہور ہیں اور سٹیج کی دُنیا میں بہت اُونچا درجہ رکھتے ہیں۔ دو سو سال ہوئے رُوسی رقص (BALLET-RUSSE) — یہیں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ یہ شہر یکتائے روزگار رقاصہ پاؤلووا کا وطن ہونے کا فخر رکھتا ہے۔ پاؤلووا اپنی زندگی میں ایک کہاوت بن گئی تھی۔ خدا نے اس کو پیر نہیں دیے تھے، بلکہ پَر دیے تھے۔ وہ ایک نغمۂ متحرک تھی جو آج بھی انسانی ذہن میں گونج رہا ہے۔ اس شہر کو "اُلانووا" جیسی بیلرینا، "چائے کو وسکی" جیسے موسیقی ساز اور "رے پن" جیسے مصوّر کی زاد بوم ہونے پر ناز ہے۔ پشکن جیسے مصنف اور "نائے جنسکی" جیسے رقاص اسی زرخیز مٹّی سے اُٹھے ہیں۔ تاریخ کے ساتھ مُلاقات ذرا لمبی کھنچ گئی تھی۔ ہماری آنتیں کھنچ رہی تھیں اور وہ شیطان کی آنت ختم ہونے کا نام نہ لے۔

"خُدا کے واسطے لیپیٹو اپنے عہد اور سمیٹو اپنی صدیاں"۔ بروز جمعہ ماہ دسمبر سال ۱۹۶۰ء میں بوقت دو بجے دوپہر شدید قسم کی گھڑیالی بھوک لگ رہی ہے۔ "میں اس وقت سارا لینن گراڈ ہڑپ کر جاؤں گی اور تم آثارِ قدیمہ میرے پیٹ میں تلاش کرتی پھرنا۔" میں نے احتجاج کیا۔ زویا اپنے کلچر کے تحفّظ کی خاطر ڈر کر فوراً مجھے ایک ریسٹوران میں

لے گئی جو "پیروشکی" کے لیے مشہور ہے۔ یہ پیروشکی ایک باریک پرت دار لمبے سموسے کی طرح ہوتی ہے جس میں قیمہ یا چاول یا سیب کا قوام بھرا جاتا ہے۔ ہونٹوں کی ہلکی سی جُنبش سے ٹوٹ جاتی ہے اور جتنی بھی کھا ڈالو پیٹ میں رسید بھی نہیں ملتی۔ پھر لینن گراڈ کی ایک اور مخصوص چیز کھائی وہ تھی (SMOKED BEEF SAUSAGES)۔ بچّوں کے لیے وہاں کی مشہور مٹھائیاں (QUEEN OF SPADE) اور ESMERALDA لیں۔

کچھ تھکاوٹ کچھ غنودگی غذا، گھوڑے بیچ کر سوئی۔ دُوسرے دن مجھے جس چیز کا بے چینی سے انتظار تھا اور جس کا شوق مجھے اتنی دُور لایا تھا۔ وہ وہاں کا شہرتِ عالمگیر کا وارث HERMITAGE تھا جو ابتدا میں تو زارآن کار زار کا محل رہا تھا، لیکن اب ایک عجائب خانہ تھا اور رُوسی معاشرہ کی زبردست نمائش گاہ۔ یہ ہزاروں سیّاحوں اور تماشائیوں کا مرجع ہے اور اس کو نظر انداز کرنا رُوسی تاریخ اور تہذیب سے گُریز کرنا ہے۔ اس عجُوبے کے ایوان چھ حصّوں میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں میلوں لمبے برآمدے اور غلام گردشیں ہیں۔ اس حیرت کدے کے ۱۵۰۰ کمروں میں سے صرف ۴۰۰ کمرے عوام کے لیے کھول دیے گئے ہیں جن کی وسعتوں میں ماضی کے شاہی خزانے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اس بھڑکیلے عہد کے عیش و عشرت کے سامان دیکھ کر انسان سمجھ سکتا ہے کہ ۱۹۱۷ء کا خونچکاں انقلاب کیوں آیا اور کیسے آیا۔ یہ عجائب گھر ایک عبرت کدہ ہے جس سے دُنیائے فانی کے وقتی جاہ و حشم، انسانی خود زیبائی اور خود پرستی کے انجام کا سبق ملتا ہے۔ پیرس کا لوور LOUVRE اور روم کا ویٹیکن (VATICAN) نمائشِ عجائبات میں اس کے ہم پلّہ ہوں تو ہوں، لیکن اس محل کی ذاتی عمارتی امارت

میں بہت پیچھے ہیں۔ اس محل کے سارے کمروں میں پندرہ قسم کی مہنگی اور نایاب لکڑی سے فرش پر طرح طرح کے نمونے گلکاری کے روپ میں نمایاں ہوئے ہیں۔ یہ مہنگے اور حسین فرش ہمارے گرد آلود جوتوں کے لیے نہیں بنے تھے۔ میرا دل تو بے ساختہ چاہتا تھا کہ ابھی یہیں خالی تخت پر سے تالی بجے اور شاہی بیلے وہیں شروع ہو جائے۔ ملاکیت (MALACHITE) ایک سبز رنگ کا قیمتی پتھر ہوتا ہے جس کی ایک قیمتی صندوقچی تین چار سو روپے میں آتی ہے۔ اس محل میں ہال کے ہال ملاکیت کے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہال کے اونچے اونچے ستون بیش بہا لاجورد کے بنے ہوئے تھے۔ دروازوں کے گول ہتھے بڑے زمرّدوں کے تھے جو انڈے کے برابر تھے۔ کئی ہالوں میں قدیم مصری، چینی۔ روسی، یونانی، جاپانی، عربی، ہندی معاشروں کے ذخیرے آراستہ تھے۔ ہر ملک اور معاشرے نے اپنی نمائندگی وہاں پر کی ہوئی تھی۔ سائبیریا کی کانوں کو کھودتے کھودتے زمانۂ سلف کے آثار قدیمہ فراہم ہوئے ہیں جن سے سن عیسوی کی پیشتر تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ سائبیریا کے ذخیرہ میں مجھے سونے کے زیورات بہت پسند آئے۔ نہایت حسین سونے کے کنگن، سونے کی ہنسلیاں اور بُندے۔ ایک بُندے پر اتنا نفیس اور باریک کام تھا کہ نظر کام نہیں کرتی تھی۔ نہایت ننّھے ننّھے گھوڑوں کے گُچھے (اتنے چھوٹے کہ صرف خوردبین سے ہی نظر آسکیں) لٹک رہے تھے۔ سونے کے کھلونے، سونے کے دیوتا، سونے کے تاج اور عصا۔ غرض یہ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اتنے ہزار سال پہلے بھی انسان کیسی کاریگری پہ حادی تھا۔

زاروں کے اپنے زیورات ۴۵ الماریوں میں سجے ہوئے ہیں۔ ان جواہر

کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں (ہماری غریب آنکھیں) پہلے تو بند ہونے لگتی ہیں، پھر اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ ہر بڑا ہیرا ایک چھلا ہوا آلو معلوم ہوتا ہے اور ہر بڑا زمرّد ایک کچّا امرود۔ ٹرکی کے سُلطان نے ایک کمبل تحفتاً بھیجا تھا جس میں ۸۹ ہیرے ٹکے ہوئے تھے۔ جو ہماری اٹھنّی سے ذرا چھوٹے تھے۔ ایک تلوار تھی جو ہیروں سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس طرح چمک رہی تھی جیسے اندھیری رات میں کہکشاں۔ ایک نہایت حسین درخت ملکہ کو تحفہ میں ملا تھا جو سارا کا سارا سچّے موتیوں کا بنا ہوا تھا۔ ہر پتّہ شاخ، ہر تنا دُرِ نادر سے پرویا ہوا۔ درجنوں شراب کے جام پُکھراج کے تراشے ہُوئے۔ کھانے کے ڈونگے برتن یاقوت کے بنے ہوئے تھے۔ پھر انسان تو کُجا حیوانوں کے برتن سونے چاندی کے۔ شاہی اصطبل کی بالٹیاں، گھوڑوں کی زینیں، سونے کی اُن پر جھول، ہیروں سے آراستہ۔ لگام پر ہیرے ٹکے ہوئے۔ ان کے ایوان در ایوان اٹلی کی نہایت دلکش مینا کاری، وینس کے بلّور اور چیکوسلاویکیہ کے کانچ سے، ہندوستان اور چین کے سنگ مرمر، ہاتھی دانت سے، کئی سو سال کے قدیم اور متبرک ICONS سے کئی عہدوں کے تحائف سے ملبّب تھے اس کے مصوّری کے ایوانوں میں اڑھائی سو (PICASSO) ۲۵ REMBRANDT اور درجنوں RUBENS ہیں۔ LEONAVDO DAVINCI کے کُل چودہ کینوس میں سے دو تو یہیں پر ہیں۔ اس کے تہہ خانوں میں تاثراتی فن (IMPRESSIONISTIC ART) کے ذخیرے اَٹے پڑے ہیں۔ صرف ایک قطار میں اکیس MATTISSES کھڑے ہیں۔ آنکھیں دنگ۔ دل تنگ۔ قدیم وجدید آرٹ کا پُورا جلاب وہ بھی ڈبل ڈوز، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چلتے چلتے میرے گُردوں میں درد ہو گیا۔ پاؤں سُوج گئے۔

جُوتے چھوٹے ہو گئے۔ آخر ہم نے اپنی تنومند گائیڈ کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ "تم ہم پر رحم کرو اور صرف ہم کو عجائب گھر کا خلاصہ دے دو۔ ہم گھر جا کر پڑھ لیں گی ہماری چُولیں ڈھیلی ہو گئیں"۔ لیکن ابھی رُوسی تاریخ کے صرف چند اوراق پلٹے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ ہم نے سیّاحوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کیے اور ایک ایک صدی اور ایک ایک عہد منٹوں میں طے کیا۔ طبیعت زچ ہو گئی۔ دل چاہتا تھا کہ ہم بھی ایک عجوبہ بن کر شاہی چھپر کھٹ پر دراز ہو جائیں اور پھر ہفتوں نہ ہلیں۔ کوئی ٹوکے تو کہہ دیں کہ بھئی ہمیں معاف کرو ہم شہیدِ سیاحت ہیں۔ تاریخی تجسّس کا شکار ہو گئے۔ دماغ چرخ کھا گیا ماضی کی داستانیں سُن سُن کر ان شوکت کدوں سے گرتے پڑتے لڑکھڑاتے باہر نکلے کہ ایک دم میرے کوٹ کو پُشت پر جھٹکے لگے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو چند ننھے ننھے شریر لڑکے پنسل اور قلم کی فرمائش کر رہے تھے۔ میرے سامنے پہلی دفعہ رُوس میں کسی نے ہاتھ پھیلائے تھے اور وہ بھی اوزارِ علم کے لیئے، میں نے بٹوہ کھولا، تو ایک پنسل ایک بال پین نکلا جو اِن بچّوں کو دے کر جان چھڑائی۔

"سُرخ تیر" نے پھر موسکو کا رُخ کیا اور میں نے بستر پر لیٹ کر دو عدد اسپرو کے ساتھ ایک عدد قسم کھائی کہ آئندہ تاریخ کے تھان کے تھان اپنے چھ انچی دماغ میں لپیٹنے کی کوشش نہیں کروں گی اور صبح ہوتے ہی چائے کے گھونٹ کے ساتھ یہ بھی قسم کھائی کہ اگر زندگی رہی، تو ایک مرتبہ پھر لینن گراڈ دیکھوں گی، لیکن اب کے گرمیوں میں اور ذرا اطمینان سے۔

یہ آخری تین مضامین ان تاثرات کی جھلکیاں
ہیں جو میری ڈائری کے غیر سنجیدہ اوراق
میں منتشر ہیں۔

کراچی سے نیپلز

(دس روز بحری جہاز ایشیا پر)

صبح کے دُھندلکے میں بحری جہاز نے لنگر اٹھالیا اور خراماں خراماں وطن کے ساحلوں سے دُور اجنبی پانیوں میں ایک نقطہ سا بن کر گم ہوگیا۔ زندگی نے وسیع تر زاویے اختیار کرلیے۔ مجھے بھی اپنی رُوح کو کھینچ تان کر خودداری کے تقاضے سے اِن کی پیمائش پر پُورا اُتارنا تھا۔ شڑپ۔ شڑپ۔ چھپ۔ چھپ پانی کا سینہ چِرچِر کٹتا جارہا تھا۔ نئی زندگی، نئے پانی، نئے اُفق، نئے آفتاب، ایک نئی بھُوک، ایک مزید تشنگی، سحرِ نوخیز کی الھڑ کنواری لہریں، سُورج کا دُھلا دُھلا بھولا بھالا چہرہ جس کو دیکھ کر لہریں حیا سے اور ڈوب ڈوب جاتیں، ڈبکی کھاتیں، پھر اُبھرتیں، بکھرتیں۔ جہاں تک نظر جاتی ایک رواں انقلاب، ایک بے تاب سراسیمہ ہلچل۔ آسمان تک ہلنے لگا، ڈولنے لگا۔ ایک لہر لپکی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا، تھامنے کے لیے، لیکن وہ آدھے راستے میں دم توڑ گئی۔ میں بھی اور لہریں۔ دماغ میں، دل میں، رُوح میں، ساری جان میں پانی سائیں سائیں کرتا نکل رہا تھا۔ میری ننھّی سی خودی غوطے کھانے لگی۔ کہاں یہ بے اندازہ پانی، کہاں مَیں! کہ ایک دم خودی نے جھرجھری لی اور اُبھر کر آبی وسعتوں پر چھاگئی۔

قدرت کے تین عنصر یہاں مل کر کامل ہوئے۔ آب، آسمان اور میری لازوال رُوح۔ میری رُوح نے سمندروں کو گہرائی دی، نیلی آسمانی بھاپوں کو ملائم نرمی دی، لہروں کو شوخ حرکت، بے کراں سفید جھاگوں کو پاکی، مدّو جزر کو لچک، ساری کائنات کو ذوقِ زیست۔ ہر لہر ایک ننھے سے بھڑکتے آتش فشاں کی مانند اُمڈتی، پھٹتی اور میرے خوابوں کی طرح روشنیوں میں تحلیل ہو جاتی۔ زمانۂ رفتہ کی تمام شاعری و جنوں، میرے آنے کی پیشین گوئی۔ میرے بعد آنے والا تمام عشق و نغمہ میری گونج، میری جھنجھناہٹ میری رُوح سمندر کی رُوح پر غالب تھی۔ واپس اپنے کیبن (CABIN) میں آ کر بچیوں کو اُٹھایا۔ تب نو بج رہے تھے۔ میم لوگ صاحب لوگ ناشتہ کرنے ڈائننگ ہال میں جا رہے تھے۔ ہماری میز کا نمبر آٹھ تھا۔ ہم جا کر بیٹھ گئے۔ سب ایک دُوسرے کو مُسکرا مُسکرا کر "گڈ مارننگ" کر رہے تھے۔ جہاز میں مُسکرانے کی شرط لازم ہوتی ہے۔ اگر آپ مُسکرانا بند کر دیں، تو جہاز کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیں گے جو آپ کو معجونِ مسرّت کی گولیاں کھلائے گا۔ اگر آپ گفتگو کی بندش سے آزاد ذرا ایک طرف خاموش بیٹھ جائیں، تو خادمہ متلی، چکّر کی دَوالے کر سامنے کھڑی ہے۔ خیر ناشتہ کیا تھا پُورا کھانا تھا۔ آدھی چیز کھا کر نیت سیر ہو گئی۔ کچھ صحّت منداس طرح کانٹے چھُری سے اُلجھ رہے تھے گویا کہ جہاز کا پُورا ٹکٹ کھانے سے وصول کر لیں گے۔ ہم ٹہلتے ہُوئے باہر نکلے۔ جہاز ایک وسیع تفریح گاہ تھا۔ دو نہانے کے تالاب۔ مختلف کھیلوں کے کورٹ۔ بچّوں کی نرسری الگ۔ دُنیا جہاں کے خوبصورت بچّے اس جہاز پر جمع تھے۔ ہر ناپ کا بونا لڑھکتا نظر آتا تھا۔ دس بارہ لڑکیاں میری بچیوں کی اور اُن سے زیادہ اُن کی امّاں کی سہیلیاں بن گئیں۔ جہاز ایک گُم گشتہ جزیرہ ہوتا ہے جس میں انسان کم اور وقت زیادہ ہوتے

سے دوستیاں بہت جلد ہو جاتی ہیں۔ دس دن جب ساتھ رہنا ہو تو کیوں نہ ہنس کر مل بیٹھ کر گزارے۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے۔ مَیں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا اللہ کوئی سخن فہم نہ مِل جائے، لیکن بچاؤ ناممکن تھا۔ جنرل رضا اور اُن کی بیگم سامنے آرام کُرسیوں پر لیٹے ہُوئے تھے۔ اُن کا رُخ پیکنگ سے پیرس کی طرف پھر گیا تھا، ایک قدیم تہذیبستان سے اُٹھ کر دُوسرے تہذیبستان کی طرف۔ آنے والے سوشل بھنور میں پڑنے سے پہلے وہ اپنے اعصاب کی پٹّی کھول کر دھوپ سینک رہے تھے۔ ایک صاحب سوئٹزرلینڈ کے سفیرِ اعلیٰ تھے جو ہندوستان سے کئی سال کے بعد مراجعت کر رہے تھے۔ تاریخ اور علم کا ذخیرہ تھے۔ ان کی گفتگو سے طبیعت کو جِلا ملتی تھی۔ وہ راستے کی ہر بندرگاہ اور ہر ننھے مُنّے جزیرے کی حکایات و روایات سُنایا کرتے تھے۔ رات کو ناچ رنگ، کھیل تماشوں سے پہلے رخصت ہو جاتے تھے۔ یہ کہہ کر "یہ سب کارخانی تفریحات ہیں منظّم لطف کا میں قائل نہیں۔"

ہندوستان کے سفیر راگھوان اور ان کی شریمتی جی نہایت گمبھیر اور گُنی آتمائیں تھیں۔ ملایا کی تحریکِ آزادی میں ایک اہم حصّہ لے چکے تھے۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی جچی تُلی رائے بِنی تُلی آواز میں سُن کر تن من شانت ہو جاتا تھا۔ رُومانیہ کی سابقہ ملکہ اور برازیل کے موجُودہ سفیر دونوں ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ اور عُمر کی بُردباری کا بوجھ دن بھر تو برداشت کر لیتے تھے، ڈنر کے بعد جام کے ساتھ احساسِ پیری بھی کھڑکی سے باہر پھینک دیتے تھے۔ لہروں پر کُچھ کانچ کے ٹکڑے، کُچھ سفید بال تیرے اور غائب ہو گئے۔ شاہِ افغانستان کے قریبی رشتے دار سفیر منتخب ہو کر امریکہ جا رہے تھے۔ جوان، ذہین، شائستہ اور مغربیت میں سرشار۔ بیوی ایک حسین پیکر۔ چغتائی آرٹ

کی زندہ نمائش! اُن کی چشمِ مخمور میں ہر وقت مشعلیں سلگتی رہتی تھیں۔ ایک بزرگوار جو بہت نمایاں نظر آئے، وہ تھے B.B.C. کے ریٹائرڈ گورنر اور انگریزی تمدّن کی اعلےٰ مثال، کیونکہ جہازی لائبریری میں سوائے شکاریوں اور اناڑیوں کے مشاغل کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اس لیے ہم ایک دُوسرے کے لیے کُتب خانہ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اُنھوں نے لندن پہنچ کر مجھے B.B.C. کی سیر کرائی۔ ایک افریقی نائیجیریا کے زراعتی ڈائریکٹر تھے۔ دُوسرے امیر نیگرو سوداگر تھے۔ غرض کہ مختلف دیس مختلف بھیس، کیا کیا نمونے، کیا کیا تقدیروں کا یہاں سنگھم ہوا تھا۔

گیارہ بجے گرم گرم سُوپ پیش ہوا۔ میں باہر کھڑی موجوں کے ساتھ اُسے بھی پی رہی تھی۔ پانی چاروں طرف پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ اِس کی بے قراریاں، بیتابیاں کس کے لیے؟ یہ سیماب کی سلطنت کیوں لرزاں ہے؟ آخر اِسے بھی کبھی نِروان ملے گا؟ خود زندگی کی طرح یہ بے پایاں تسلسل جس کی بلّوری آغوشوں میں نیلگوں تہوں میں کیا کیا راز، کیا کیا معمّے پنہاں ہیں؟ آفتاب اپنی پُوری جودت پر آچکا تھا۔ نیلے میدانوں کو چھوڑ کر ستارے نیچے اُتر آئے تھے۔ کروڑہا کرنیں، لکھوکھا لہروں میں لرزاں و رقصاں! ایک جواہرِ ن جزیرہ جس میں موتیوں کی بارش، روشنیوں کے فوّارے!

دیکھے جاؤ۔ دیکھے جاؤ۔ گھنٹوں دیکھے جاؤ۔ نظر تھکتی نہیں۔ نیّت بھرتی نہیں۔ آرام کرسی پر پاؤں پسارے لیٹے دیکھا کیے۔ آنکھیں بند کرلیں، تو سمندر کانوں میں اُتر آیا۔ ایک پانی کی دُنیا پیچھے! ایک پانی کی دُنیا آگے! آسمان اور سمندر کے رنگ یکساں۔ اُفق کی باریک تقسیم بے معنی۔ واللہ اعلم سمندر اُوپر چل رہا تھا کہ آسمان نیچے بہہ رہا تھا۔ یا اس ہمہ گیر آبستان میں ہمارا گشادہ محل ایک سفید جھینگے کی طرح اللہ حوالے بھیلتا

چلا جا رہا تھا۔

لنچ کا وقت آیا۔ مع اپنے تین فرشتوں کے ہال میں داخل ہوئی۔ باوجود لمبے چوڑے ناشتے کے بھوک پھر بھڑک اُٹھی تھی۔ کیا آب و ہوا تھی کہ جو کھایا ہضم۔ ہمارے سامنے فہرستِ طعام آئی۔ دس قسم کے عرقی مشروب اور بھوک کو جلا دینے والے لوازمات۔ پیٹ تو اگر بھرنا چاہے تو وہیں تک پہنچ کر بھر جائے۔ آگے چلے تو مچھلی چار قسم کی۔ ہر ملک کے کھانے گرم گرم بُھنے ہُوئے، تلے ہُوئے۔ ورق پلٹا تو معلوم ہوا کہ ہندوستانی کھانے بھی ہیں کم از کم دو درجن انواع و اقسام کے۔ اسائیڈ بورڈ پر ٹھنڈے گوشت مختلف طریقوں سے سجے ہوئے تھے۔ دیکھ دیکھ کر پیٹ بھر گیا۔ سامنے ایک جوڑا خاموش بیٹھا کھا رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں نے اپنی شادی کی پہلی رات کے بعد ایک دُوسرے سے پھر کبھی بات چیت نہیں کی! ایک سنجیدہ اور مدّبر انگریز عورت "Mrs. BRAY" جنہیں بچے بیگم ڈھینچوں پکارتے تھے ساتھ میز پر بیٹھی برج کے آخری ہاتھ کا تجزیہ اُسی گرم جوشی سے کر رہی تھیں جس طرح مُرغی کی ٹانگ پر جراحت۔ ایک لحیم شحیم دولت مند ڈچ اور اس کی نئی نویلی دُلہن جو چھٹے مہینے سے تھی، داخل ہُوئے۔ دونوں سمارٹ اور خوبرو تھے۔ نہایت مہنگی پوشاک میں ملبوس آپس میں مگن، کسی اور سے بات کی خواہش نہیں۔ میں نے سوچا خدا ان کی محبت کو اور پروان چڑھائے۔ چار دن بعد مجھے دعا کا رُخ بدلنا پڑا۔ مجھے میرے دوستوں نے بتایا کہ یہ اس کی تیسری بیوی ہے اور اس امیر ڈچ کو یکے بعد دیگرے حُسن کی اجارہ داری کا شوق ہے۔ جہاں مہنگی دھاتیں اور قیمتی پتھر خریدے وہاں لڑکیاں بھی خرید لیں، لیکن اس شخص کی اصلیت ایک مہلک بیماری تھی جس کا دماغ

سے تعلق تھا۔ نہانے کے پُل پر اُس نے ایک دو کمسن بچیوں کو چھیڑا اور اُن کے والدین نے مجھ سمیت سب کو آگاہ کر دیا کہ اس جہاز میں "لولیتا" (LOLITA) کا ہیرو موجود ہے۔ کیا دُنیا ہے! میں نے جب یہ ناول پڑھا تھا، تو اُٹھا کے پھینک دیا تھا، کہ یہ حقیقت نہیں ہو سکتی، اور اب خود سامنا کرنا پڑا۔

میری نمبر دو یوں تو گھر میں کٹّر برہمن تھی، گوشت نک ناک چڑھا کر کھاتی، جہاز میں پہنچتے ہی وہ آدم خور بن گئی اور اب وہ کبھی گرلڈ کبوتر اور کبھی بھنا ہوا خرگوش منگاتی تھی۔ میں حیران اُس کا مُنہ تکتی اور نظر پھیر کر مُنہ میں نوالہ ڈالتی۔ میری نظر کے سامنے کبوتر کی آنکھیں پھڑک رہی تھیں اور خرگوش کے کان ہل رہے تھے۔ انتڑیاں اُلٹ گئیں، لیکن دَم سادھ کر چپ۔ بچی کی جھجک ہٹی تھی۔ خدا خدا کر کے کُفر ٹوٹا تھا۔ اس کے رگ و ریشے میں شیر شاہ سُوری نے جو نعرے لگانے شروع کیے، تو اُس نو مسلم نے ہر حلال چیز پر ہاتھ ڈال دیا۔ جب کیکڑوں اور کینچوؤں پر پہنچی، تو میں نے ہاتھ تھام لیا۔

لنچ کے بعد ہم کافی پیتے دُوسرے کمرے میں آ گئے۔ اٹلی کا نغمہ سرا "اپولو" دیوتا کی طرح وجیہہ و شکیل اپنے گیٹار پر ہلکی ہلکی دُھنیں سنا رہا تھا۔ موسیقی اور نیند کا سُرور چڑھنا شروع ہوا۔ مونا لیسا اور لاس ویگا کی باتیں دُھندلی ہونے لگیں۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچے اپنے کومکس میں مستغرق، مَیں نے جھپٹ کر سب کو مکس ٹوکری میں پھینکے اور تینوں پر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر تیّار ہو کر چائے کے لیے میوزک ہال میں گئے۔ کچھ رسمی گفتگو، کچھ نئی ملاقاتیں، نئے تعارف۔ ٹہلتی ہوئی باہر آئی۔ سمندر کا جنون بدستور، جوبن چشم بد دُور۔ جلتی دھوپ کی تیز دھاروں میں آتشیں نُور کے جھرنے اُبل پڑے تھے۔ کچھ صاحبان

ٹہل ٹہل کر ڈنر کے لیے بھوک تیز کر رہے تھے۔ ایک پچّاس سالہ آسٹرین جھرّ وں ہیل والی لکڑی کی کھڑاؤں پر ڈیک کے بیس چکّر کاٹ چکی تھی اور ہر دفعہ ہاتھ کے اشارے سے اُنگلی پر گن کر بتاتی کہ یہ میرا فلاں نمبر کا چکّر ہے۔ تبّت کے دعائیہ چرخے کی طرح نیک بخت سارے وقت گردش میں رہتی اور اپنی ضعیف مُسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ راہ چلتے سب اس کی باتونی زبان سے بیزار تھے۔ جہاز میں ہر ایک اپنی خلوت کو ایک ناجائز وراثت کی طرح چھپا چھپا کر بچتا پھرتا ہے۔ صرف شام کے بعد قوّتِ گویائی اور ذوقِ صحبت عود کر آتے ہیں۔ ورنہ سب اپنے اپنے مشغلوں میں منہمک ہوتے ہیں۔

شام سے پہلے اسٹاف کو بھی چھٹی مل گئی۔ یہ سفید سوٹوں میں جواں سال لڑکے ہنستے، گنگناتے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے نکلے۔ بجائے لہروں کے ان کی نظریں لڑکیوں پر تھیں۔ ایک دو سفید چڑیاں ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ فوراً اُن کے ساتھ ہم قدم ہو گئیں۔ جوانی، موقع اور جہاز ایک وقت میں ہم کنار ہوئے تھے۔

سُورج رفتہ رفتہ اپنی منزلِ غروب کی طرف کھسک رہا تھا۔ اپنی نارنجی بلندیوں میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ! جاتے جاتے وہ اپنی تمازت اور سُرخی سمندر کو سونپ رہا تھا۔ دہکتے ہُوئے سُورج نے پہلے اپنے پیر پانی میں بچھائے۔ ہلکا سا دھُواں اُٹھا اور مغرب میں پھیل گیا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے تنِ تپیدہ کو سپردِ آب کر دیا۔ اُفق پر سفید سوگ چھا گیا۔ سمندر بھی سرمئی تعزیت میں سرنگوں ہو گیا۔

لائبریری میں ٹہلتی ہوئی گئی۔ کچھ نرم نرم صوفے، کچھ نرم نرم فضا، ایک دو صاحبان شیرِ علم پیتے پیتے وہیں سر رکھ کر سو گئے تھے۔ ایک صاحب کتاب ناک کے اتنے قریب

رکھ کر پڑھ رہے تھے گویا ناک کی بینائی کم ہوتی جارہی ہو۔ سب خانوں پر باری باری نظر ڈالی۔ جاسوسی قصّے، افریقہ کی سفاری، آدم خوروں کا شکار، وہیل مچھلی کا خاندانی شجرہ، شارک کی ذاتی عادت، مگرمچھ کی غذائی مرغوبات، کچھوے کے ازدواجی حالات، جل پریوں کے نغمات اور سمندری بونوں کے پریس کو بیانات۔ غرض کہ سب ہتھیار تھے جن سے وقت اُلٹی چھری سے ذبح ہو سکتا ہے۔ قسمت سے ایک کتاب دبکی ہوئی مل گئی۔ "آسمانوں کو کس طرح کھرچا جائے"۔ امریکہ کا خاکہ ایک مشہور مزاح نگار کے ہاتھوں۔ کرسی پہ بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ ایک لمبا امریکن لمبی سی کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک لمبی سی مسکراہٹ شائع کی اور اپنا لمبا سا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا۔ جب اُس کی نظر کتاب پر پڑی، تو مسکراہٹ سکڑ گئی، چہرہ لٹک گیا اور کُرسی کھسک گئی۔ نقصان اِس کا ہوا۔ اگر وہ ذرا اطمینان سے بیٹھتا تو میں بتاتی کہ اس مزاح نگار نے انگریزوں، جرمنوں، اسرائیلیوں، فرانسیسیوں کی بھد بھی اسی طرح اُڑائی ہے۔ ایسی کتابیں جی کو نہیں لگانی چاہئیں۔

اپنے کمرے میں واپس آئی تو وہاں میرے سُوٹ کیس کی ساڑھیاں گھسیٹ کر ڈرامے ہو رہے تھے۔ میری سفید بنارسی ساڑھی کی مٹی پلید "سنو وائٹ" کر رہی تھی اور لال ساڑھی کی "ریڈ رائڈنگ ہوڈ" سب کو کمرے سے نکالا اور ساڑھیاں استری کرنے کے لیے کیبن کی خادمہ کو دیں۔

ڈنر پر خوب رونق تھی۔ ابھی دن بھر جو میمیں تیل لگا کر دھوپ میں اوندھی سیدھی لیٹی ہوئی بھورے بھورے۔ چکنے چکنے بھوت لگتیں تھیں۔ اب شام کے لباس میں ایک دوسرا عالم پیش کر رہی تھیں۔ ہمارا اطالوی ویٹر "ایلبرتو" بڑے خنداں صبر

سے بچّوں کی نئی نئی فرمائش پُوری کرتا اور بہت ادب اور سلیقے سے مجھے خراجِ تحسین پیش کرتا۔ میرے خیال میں ہر میز پر یہی خراج دیے جارہے تھے جو ہمیں بعد میں بہت مہنگے پڑے۔ چلتے وقت اُن کو "کومپلیمنٹ" کے سبب دوگنا انعام دینا پڑا۔ کچھ دیر میں طشت پر سجا ہوا "خنزیر بزغالہ" (SUCKLING) آیا۔ میری نمبر ۲ نے بغیر ذات پہچانے شیخی میں للکارا کہ "میں یہ بھی کھا سکتی ہوں"۔ میں نے کہا تم حلال خوری پہ اُتری ہو تو سب کھا لو صرف اس کی جان بخش دو۔ اُس نے دوبارہ جو جانہار کی تھوتھنی پر نظر ڈالی تو اُبکائی لے کر مُنہ موڑ لیا۔ اور "ایلبرتو" نے بھی خفت میں منہ بنا لیا۔

اطالویوں نے اِس جہاز پر غذا کو نہ صرف ایک آرٹ بنایا تھا بلکہ سائنس کی حد پر پہنچا دیا تھا۔ اس لیے میں اِن کے ہنر طباخی کو "فوڈی اولوجی" کہتی تھی۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہوا کہ جہاز کا ہیرو اصل میں اِن کا "چیف شیف" تھا جس کا "خروش چیف" سے کوئی رشتہ نہیں۔ اِسی داروغۂ مطبخ کے سر مسافروں کی خوشنودی اور خوشحالی کا سہرا تھا۔ جہاز میں صحت، زندگی، چونچالی سب اس کے کھانوں کی برکت تھی۔ لوگ اِس کے طعام کے انتظار میں طرح طرح سے اپنے کو بہلاتے پھسلاتے۔ قلابازیاں کھاتے۔ دسترخوانی جدّتوں کی بدولت خوش مزاجی کا پارہ اتنا اُوپر چڑھ گیا کہ ایک اجتماعی اتّحاد اور رواداری دیکھنے میں آئی، بلکہ کسی حد تک اس دسترخوان نے ازدواجی تعلّقات کو بھی تکیہ دیا۔ کئی ترش رو جوڑے جو ایک دُوسرے سے کنارہ کش تھے، کھانے کی میز پر دو گھنٹے بیٹھ کر ڈشیں اور گپیں اُڑایا کرتے تھے۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچی کہ دُنیا کی جذباتی، نفسیاتی، اقتصادی، رُوحانی، ثقافتی، شعوری، غیر شعوری جنسی تاریخی، رومانوی بیماریوں کا مجرّب نسخہ عُمدہ غذا ہے۔

میں تو اپنے سے اندازہ لگاتی تھی کہ جب آئی تھی ہماری قومی علالت کے بعد رنگت ملگجی اور پیٹ ملیدہ۔ چار دن میں کچھ سمندری ہوا کا نمک اور کچھ باورچی خانے کا نمک ایسا راس آیا کہ کینچلی بدل گئی۔ آئینے کے سامنے اجنبی شکل! خیر۔ مرد پورے اخبار کا مطالعہ کر کے اندازہ لگاتے ہیں کہ دُنیا کس طرف جا رہی ہے۔ عورت آئینے میں صرف ایک نظر ڈال کر بتا دیتی ہے کہ دُنیا اچھی جا رہی ہے یا بُری۔

بڑے ہال میں بینڈ بڑے زور شور سے نہایت سُریلے دعوتی رقعے بانٹ رہا تھا۔ سب اس طرف قبلہ رُو ہوئے۔ میں اپنے تین پاسبان فرشتوں کے جلو میں گھسی اور جنرل رضا کی میز پر شامل ہو گئی۔ لاطین امریکہ کے یوروگوائی میئر (MAYOR) سے تعارف ہوا جو کشمیر میں (U. N. OBSERVER) کی حیثیت سے تصویر کے دونوں رُخ سے بخوبی واقف تھے۔ یہ موسیو رالوار یز کوئی پینتالیس سال کے شریف شکل، درمیانہ قد ڈپلومیٹ تھے۔ تعارف کچھ چبا چبا کر ہوا، وہ سمجھے نہیں کہ میں کون ہوں، دس منٹ کی گفتگو کے بعد جنرل رضا کے پاس پُوچھنے گئے کہ "آپ کی اجازت ہو تو آپ کی بیٹی کے ساتھ رقص کر لوں" جنرل رضا نے چاروں طرف دیکھا کہ اُن کی چھ سالہ بیٹی اتنی جلدی کیسے اُگ کھڑی ہوئی۔ جب اشارہ صاف ملا تو بے اختیار ہنس دیے۔ "صاحب ضرور جائیے۔ میری پُوری اجازت ہے۔" میں نے فرشِ رقص پر جانے سے معذرت کرتے ہوئے ان موسیو رسے پُوچھا:

"یہ آپ اجازت لینے کیوں گئے تھے؟"

جواب ملا: "کیا کروں آپ کے مُلک میں ہر چیز کی اجازت لینی پڑتی ہے۔ پنڈی میں مَیں جب کسی خاتون سے بات کرتا تھا تو پہلے ان کے والدین آجاتے

تھے، پھر پولیس، پھر فوج۔"

مَیں نے اِن کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا: جنرل رضا میرے والد نہیں ہیں، بلکہ میں ایک عدد والدہ ہوں جس کی تین بیٹیاں وہ سامنے بیٹھی چاکلیٹ چبا رہی ہیں، میئر نے گردن موڑ کر تین مُسکراتی ہوئی گڑیوں کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ "میں ایک سیدھا سچّا انسان ہوں، بین الاقوامی دھوکوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔" مجھے شرارت جو سُوجھی تو میں نے مظلوم شکل بنا کر کہا:

"اصل میں میری شادی تیرہ سال کی کچّی عمر میں کر دی گئی تھی۔ شادی ہوتے ہی کچھ عرصے کو میرے میاں غائب ہو گئے اور مجھے بتایا گیا کہ وہ O.S.D.[1] ہوالات لگے ہُوئے ہیں۔" موسیو الواریز ایک جذباتی شخصیّت تھے جن کی امریکیت پر لاطینیت حاوی تھی۔ وہ ایک دم میری خود ساختہ رام کہانی سُن کر اتنے نرم پڑ گئے کہ کُرسی کے بازوؤں سے بہے جاتے تھے۔ ان کا سنبھالنا وبالِ جان ہو گیا۔ بمشکل اِن کو یقین دلایا کہ میرا خاوند ایک افریقی وحشی ماؤ ماؤ سے ذرا بہتر ہے اور اب عرصے سے میں کچھ زیادہ ناخوش نہیں ہوں۔" جب میری ولیعہد نے یہ لطیفہ سُنا تو فوراً اپنے ابّی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

رات گیارہ بجے ہم اُٹھ کر ڈیک پر آئے۔ آج گیارھویں تھی۔ ہر طرف دودھیا چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سمندر ایک بڈھے شیر کی طرح بڑا مُنہ ہی مُنہ میں غرّا رہا تھا۔ سطح قدرے خاموش تھی، لیکن اندر ایک پُر اسرار ہیجان تھا۔ ایک اشتراکی تحریک تھی، جو زیرِ آب پل رہی تھی۔ نہ معلوم کُلیا میں کیا گُڑ پھوڑے کیا گُل کھلائے! مہتاب کی شہ مِل رہی تھی، اس کی مہتابیاں قُرب و جوار میں لہروں سے مل مل کر اُسے بلوے پر اُکسا رہی تھیں۔

---

[1] "افسر بکارِ خاص"

ئیں کمرے میں آ کر لیٹ گئی ۔ مجھے پہلی دفعہ سمندر سے خوف آیا۔ایک مہیب اژدھا تھا جو لمبا لیٹا سائیں سائیں کر رہا تھا اور کبھی کبھی پھَن اُٹھا کر ٹپختا تھا۔کچھ خواب بھی ڈراؤنے آئے ۔ لہریں اپنے دانت نکالے دہانے کھولے مجھے ہڑپ لینا چاہتی تھیں۔میں نے چیخنا چاہا' تو نمکین پانی حلق میں پھنس گیا۔دو ننھے ننھے ہاتھوں نے مجھے تھپکا۔میں اپنی نمبر۳ کو پیار کر کے پھر سو گئی ۔

آج صبح جہاز کے دُوسرے تختے میں "ایمرجنسی ڈرل" تھی۔جس کے معنی تھے کہ اگر آپ کا جہاز خدانخواستہ آگ سے یا ٹکر سے ڈوبنے لگے، تو کس طرح "لائف بلیٹ" پہن کر چھوٹی کشتیوں میں بیٹھا جائے ۔یہ ڈرل محض تکلفاً برائے بحری رسم و آئین کے ہوتی ہے اور سب کو یقین ہوتا ہے کہ چونکہ ایسا موقع عرصے سے نہیں آیا، اس لیے اب بھی نہیں آئے گا۔یہ جہازی کثرت ہوائی ڈرل کی عین ضد ہوتی ہے۔ہوائی ہوسٹس جب ہدایاتِ حادثات صادر کرتی ہے، تو موت کی آخری ڈریس ریہرسل معلوم ہوتی ہے۔ اور ایکٹر چاہے کتنے ہی منجھے ہوئے ہوں اصل ڈرامہ ہمیشہ گڑبڑ ہی ہوتا ہے۔ڈیک پر سب "لائف بلیٹ" کسے ہوئے سیارۂ مریخ کے باشندے لگ رہے تھے اور ایک دُوسرے پر ہنس رہے تھے۔ایک موٹی میم یہ تان تو بڑا کس کر بالکل "اِگلو"[1] لگ رہی تھیں۔یار دوستوں نے کہا کہ یہ محرابی بوجھ تو ڈوبتی کشتی کو اور ڈبو دے گا۔اسے بہر حفظِ ماتقدم ابھی سے پار کر دو۔" بھورے بھورے بادل لے لے دے دے کرتے ہوئے ایکدم کہیں سے اُمڈ آئے اور کائنات کو ملفوف کر لیا۔سمندر ایک دم گدلا ہو گیا۔معلوم ہوتا تھا بادل اپنی میلی وردیاں دھونے آئے تھے اور تسلے میں کیچڑ چھوڑ گئے۔کچھ دیر میں بادل چھٹے اور آناً فاناً جیسے اُٹھے تھے

---

[1] اگلو ایسکیمو کے گول سفید برف کے گھر کو کہتے ہیں۔

ویسے غائب ہو گئے لیکن پانی عرصے تک اُن کی کثافت شیشۂ دل سے صاف نہ کر سکا۔ دوپہری دھوپ میں یوں دکھائی دیتا تھا کہ چمکتے کولتار کے پیپے کے پیپے لنڈھا دیے گئے ہیں اور یہ بے حس گاڑھا مرکب میلوں چپاں ہے۔

بچوں کی پلٹن "ٹھپو گرم" کھیل رہی تھی۔ مَیں بھی بینگ کٹا کر شامل ہو گئی۔ کچھ دیر میں بھاگڑ مچ گئی۔ سب دوڑ دوڑ کر کٹہروں پر چڑھ چڑھ کر ہاتھ، مفلر، رُومال ہلانے لگے۔ ہمارے "ایشیا" کا ہم پلّہ "وکٹوریا" جہاز سامنے دُور رُو بہ مشرق رینگ رہا تھا۔ دونوں ہمزاد غریب الوطنی میں ہم کنار تو نہ ہو سکے، ایک دُوسرے کو جھنڈے ہلا دیے۔

لنچ کے بعد جہاز نے عدن کے پاس لنگر ڈال دیے۔ عورتیں عجیب حالتِ کیف میں آئی ہوئی تھیں۔ بازار کے نام سے اِن کی باچھیں کھلیں اور بٹوے کھلے جاتے ہیں اور جب خرید و فروخت عدن جیسی بندرگاہ میں ہو تو ساری رات وہ موتیوں کی سیج پر سوتی ہیں اور موتی آسمان میں ٹانکتی رہتی ہیں۔ ایک کی تو خاوند سے خوب جنگ ہوئی۔ وہ کڑک کر بولا:

"موتیوں کا اتنا شوق ہے تو اپنے موتی جیسے دانت توڑ کر دو کانوں میں ٹانگ لو۔ باقی گلے میں لٹکا لو، لیکن مجھ سے پیسے مت مانگو۔"

لوگوں نے سرزمینِ عدن پر اُترنا شروع کیا۔ میں ہر جوڑے کے ظاہری روّیے سے اندازہ لگا رہی تھی کہ موتی حاوی ہیں یا رضائے خاوندی، عدنی مبادلہ کار بیٹھے دو اور دو چار کر رہے تھے۔ ایک دو کی ڈاڑھیاں اور ایمان باریک نائلون کے بنے ہوئے تھے۔ باطن اندر سے نظر آ رہا تھا۔ بہر حال عدن میں آئے تھے کوئی چیز تو لینی ہی تھی جہاں سب ایک ہی حماقت کر رہے ہوں وہاں تنہا ادراک ایک مضحکہ خیز عجوبہ لگتا ہے۔ میں نے

بٹوہ جو کھولا تو روپوں کا لفافہ غائب۔ دَھک سے رہ گئی۔ یا اللہ پہلا چکر کا وہ بھی اتنا کاری۔ پھر سوچا تو یاد آیا کہ لفافہ اپنے تکیے کے نیچے پڑا ہوا ہے۔ چلتے وقت بٹوے میں رکھنا بھول گئی۔ اب یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کسی اطالوی نوکر نے بستر ٹھیک کرتے وقت اُٹھا نہ لیا ہو۔ بہرحال طبیعت پہلے بھی نہیں اُبھر رہی تھی۔ اب تو خرید و فروخت کا ارادہ بالکل ترک کر دیا۔ میری جرمن سہیلی نے اپنے رُوپے پیش کیے لیکن مجھے بھی اچھا بہانہ مل گیا۔ چاروں طرف بازار میں گھُومے۔ یورپی مسافر کیمرے۔ گھڑیاں جانچ تول رہے تھے۔ ایک جگہ چائے پی کر میں تو اطمینان سے واپس آگئی۔ واپسی پر ایک دو جوڑوں میں گرم گرم مناظرہ ہو رہا تھا۔ کئی بہت خوش مطمئن لوٹے تھے۔ کچھ عورتیں بار بار اپنے کان ہلاتی تھیں۔ کئی مرد بار بار اپنی کلائی دیکھتے تھے۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی میں نے تکیہ اُٹھایا تو لفافہ بدستور پڑا تھا۔ میں نے ایک پاؤنڈ کا صدقہ مانا تھا۔ بچّوں نے فوراً ہاتھ پھیلا دیے۔ میں نے کہا:

"جب کبھی لندن میں قلّاش ہو جاؤ تب دستِ سوال دراز کرنا ابھی نہیں!"

رات کو ڈنر کے بعد ایک انگریزی فلم دکھایا گیا جو بہت مزیدار ہلکی پھلکی کامیڈی تھی، لیکن آدھے لوگ عدن کی تھکن میں اُونگھ رہے تھے اور ہنسنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

دُوسرے دن ناشتے کے بعد ایک عمدہ ناکے پر اپنی آرام کُرسی لے کر دراز ہو گئی اور اپنی رازدان ڈائری سے ہم کلام ہو گئی۔ صفحہ پر صفحہ میرے اعمال نامے بلکہ افکار نامے سے سیاہ ہوتا گیا۔ کہاں کہاں سے خیالات اُٹھ اُٹھ کر میرے حضور میں حاضری دے رہے تھے۔ کن کن پسماندہ جذبات نے زنجیرِ توجّہ ہلائی۔ کیسی کیسی یادوں نے دہائی دی۔ میں

تھی اور دربارِ ایامِ گزشتہ۔ سامنے سمندر ایک ہری "جیلی" کی طرح تھل تھل کر رہا تھا۔ سارے وقت یہ کیوں تھلتھلاتا رہتا ہے؟ مَیں چڑ گئی۔ کمبخت کہیں چین سے مرکیوں نہیں جاتا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔ اِس کو ضرور کسی پیغمبر کی بد دُعا لگی ہے یا کسی جادوگر نے سزا دی ہے۔ اس کا یہ لامحدود کرب، یہ لامتناہی محشر! یہ اعصابی انتشار بہہ بہہ کر کہاں جائے گا۔ اس کی شروعات کیا ہیں؟ انتہا کہاں ہے؟ واللہ اعلم کہاں سے مُنہ اٹھا کر نکل کھڑا ہوا؟ کہاں جا کر رُکے گا۔ یہ عنصری قوّت آخر کس سے جا کر ٹکرائے گی؟

ایک گھنٹے کے اندر سمندر نے پھر پلٹا کھایا۔ عورتوں کے فیشن کی طرح یہ ہر دو گھنٹے میں اپنا رنگ تبدیل کر لیتا تھا۔ ابھی مٹیالا، ابھی ہرا، ابھی سلیٹی، ابھی لاجورد، کبھی بنفشئی، کبھی فیروزی۔ اس کا سینہ لمبے لمبے سانس لیتا، اُبھرتا اُترتا رہا۔ اس کی ہر موج میری تمنّاؤں کی طرح منڈلاتی اور اپنے مختصر عروج پر پہنچ کر اندرونی حُدود کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی اور پھر ازسرِنو اُمڈنے لگتی۔ اس کی خواہشیں کبھی ختم نہ ہوں گی اور اسی لیے یہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میں نے ظہر کے وقت ڈیک کا طواف کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے دلچسپ لوگ چاروں کھونٹ سے جمع ہوئے تھے۔ اللہ کی مخلوق میں کیا کیا نمونے ہیں۔ ایک خاتون "محکمۂ صحّت" تھیں جن کو میں نے "مس ہیلتھیا" کا لقب دیا تھا۔ پُوری ویل مچھلی تھیں اور غلطی سے پانی کے اُوپر آ گئی تھیں۔ دراصل اُنہیں جنس کی سمندری بلاؤں اور اپنے منگیتر مگرمچھ کے ساتھ سات ہزار گز نیچے ہم نوالہ ہم پیالہ ہونا چاہیئے تھا۔

ایک شرارہ تھیں تو صرف ۱۹ سال کی، لیکن اُن کی شخصیّت میں بیسویں صدی اپنے پُورے سنِ بلوغ کو پہنچ چکی تھی۔ اِن کا حُلیہ بیان کرنا مشکل ہے۔ پکاسو اپنے تجریدی آرٹ کے صرف دو نصف دائروں میں اُنہیں یوں "()" پیش کر سکتا ہے۔ جس وقت

وہ چہل قدمی پر نکلتی تھیں، تو سب کی نظر اُن کے جسم پر ہوتی تھی۔ کسی نے اُن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اگر یہ کل کلاں قتل ہو جاتیں، تو ان کی لاش تھانے میں پڑی رہتی اور کوئی شناخت نہ کر سکتا۔ یہ بلائے نسوانی مخلوقِ انسانی کے لیے عین ہلاکت تھی۔ جہاز کا سارا اطالوی عملہ اِس کو دیکھ کر تتر بتر ہو جاتا تھا۔ خود بے چارے کپتان کو تنظیم کا مسئلہ حل کرتے کرتے حال آ گیا۔

ایک نحیف اور ضعیف انگریز اپنی جھلملاتی جھرّیوں اور کانپتے ہاتھوں سے ایک گرم گرم رومان پڑھ رہا تھا، عنوان تھا "الوداع میری محبوبہ" یہ کتاب اسے بیس سال پہلے پڑھ لینی چاہیئے تھی۔ ایک رعشہ براندام اسّی سال کا سوئس پردادا لڑکھڑاتا پھرتا تھا۔ اِسے صرف جرمن زبان آتی تھی اور اپنی بہو کی ترجمانی کے طفیل ہر ایک سے گفت و شنید کرتا تھا۔ غریب نے ہر زاویے سے میرے فوٹو کھینچے، مگر ایک بھی اچھا نہ اُترا، کیونکہ اُس کے لرزاں ہاتھوں کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا کہ مجھے فوٹو میں لرزہ چڑھ رہا ہے! ایک فوٹو کے لیے جو گھٹنوں کے بل بیٹھا تو معصوم لڑھک گیا۔ بمشکل اُس کی بہو نے اور میں نے مِل کر اُٹھایا۔

ایک اور ستّر سال کا ندیدہ کھوسٹ اپنی جوان بیوی کے ساتھ سنگاپور کا پیسہ کما کر دُنیا کی سیر پر نکلا ہوا تھا۔ موٹاپے، بڑھاپے کی وجہ سے ڈانس ہوتا نہیں تھا۔ ہانپ ہانپ کر ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے ڈانس کرتا تھا اور بیوی کی نظر بچتے ہی اوروں پر نظر ڈالنا شروع کر دیتا تھا۔

سُورج اپنے عنابی اوج میں افروزاں سخاوت کے لنگر بانٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی روشنیوں کے بند توڑ دیے اور اپنی کرنوں کا اذنِ عام کر دیا۔ اس کی تیز حدّت میں

سمندر بھی تیز حرکت میں آگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہزار ہا بلوری جھاڑ فانوس چٹخ چٹخ کر پانی میں کرچی کرچی ہو رہے ہیں۔ ان پانیوں میں کتنے نقش بنتے اور بگڑتے! گویا کوئی بے چین مصوّر "واٹر کلرز" میں لطیف عظمتیں بے اعتنائی سے کھینچے اور پھر مٹا دے۔

شام کو "فینسی ڈریس" کا مقابلہ تھا۔ سارا دن لوگ باگ گھبرائے گھبرائے چیزیں جمع کرتے پھرے۔ ڈنر کے بعد ڈانس ہال میں سب جمع ہونے شروع ہوئے۔ کچھ سست یورپین تو ترکی ٹوپی یا عرب چُغہ پہن کر اپنے سر سے بلا ٹال رہے تھے، لیکن زیادہ تر نے اپنے فینسی ڈریس پر کافی وقت اور محنت صرف کی تھی۔ ایک عورت نے چار کیمرے گردن میں لٹکائے، دس بارہ گھڑیاں کلائی پر باندھیں۔ پانچ چھ پین جیب میں اڑسے اور شانے پر کسٹم افسر کے لیے پرچی لگی ہوئی "NOTHING TO DECLARE" ایک بزرگ جگت "انکل پارکر" تھے۔ اس جہاز میں نو دفعہ تفریحی سفر کر چکے تھے۔ ان کے بال بادبانوں کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ ان کو ہر دفعہ سپورٹس سیکرٹری چُنا جاتا اور غریب سارا دن کئی ٹورنامنٹ منعقد کرتے اور طرح طرح کی فرمائشیں پُوری کرنے میں ہلکان ہو جاتے۔ وہ ایک سفید چادر اوڑھ کر آگئے اور اس پر پرچی لگی ہوئی "سپورٹس سیکرٹری جو کبھی تھا۔ خُدا مغفرت کرے۔" وہ اُنیس سالہ نسوانی وبا جس کا ذکر آچکا ہے مٹکتی ہوئی داخل ہوئی ایک ردّی کا تھیلا بنی ہوئی۔ ایک نے فقرہ کسا کہ اس ٹاٹ کے تھیلے میں جو کچھ بھی ہے ردّی نہیں۔"

لاطن امریکی میڈم موسیو رالوا ریز کشمیری ہاتو بن کر آئے تھے۔ افغانی سفیر کی بیگم سواتی لباس و زیور میں ایک پری معلوم ہو رہی تھیں۔ جنرل رضا چینی رئیس کے لباس میں تھے۔ میری دو چھوٹی بچیاں ٹالسٹائے کا عنوان "جنگ و امن" WAR AND PEACE

بنی تھیں۔

دُوسرے دن پورٹ سعید پر جہاز کو قیام کرنا تھا۔ اِس کا آنکھوں دیکھا حال اگلے مضمون میں دیا ہوا ہے۔

قاہرہ سے واپسی پر دُوسرے دن کیپٹن کا ڈِنر تھا جو اس کی طرف سے سب کو دیا گیا تھا اور یہ آخری بڑی اور خاص محفل ہوتی ہے۔ سارا ڈائننگ ہال ایک عُروسِ نو کی طرح آراستہ اور معطّر تھا۔ سب بیگمات بنی سنوری اپنے حُسن کے احساس سے سرشار پھر رہی تھیں۔ جنوبی یورپ کے انگورستانوں سے چُنی ہوئی کشیدہ مشروبات مفت! صلائے عام تھی! طعام کیا تھا پُورا رنگین کارنیول تھا۔ "چیف شیف زندہ باد" کے نعرے لگے اور اس کو بلایا گیا۔ پانچ منٹ تک تالیوں کے شور میں وہ اطالوی گٹو کھڑا مُسکراتا رہا۔ اس وقت لوگ باگ اُس سے اس قدر خوش تھے کہ کپتان کو اُٹھا کر گدّی پر اُسے بٹھا دیتے۔ ڈنر کیا تھا۔ سبّر لوازمات اور بہتّر مسالوں میں پُورا چڑیا گھر آباد تھا۔ ہر چرند و پرند مع پَر اور پنجوں کے یونہی سالم سجا ہوا تھا۔ یُونانی روایات، رومی حکایات، مکھن اور پنیر، چاکلیٹ اور کریم میں تراشی ہوئی تھیں۔ میری نمبر ۲ کی عید تھی۔

کھانے کے بعد "گالا نائٹ" تھی۔ خوب کھیل تماشے اور رقص ہوئے۔ آج رات سارا اطالوی عملہ چھٹی منا رہا تھا۔ نازنینوں کو دائیں بائیں زبانی رشوتیں مل رہی تھیں اطالویوں سے دنیا نالاں ہے لیکن خواتین بہت خوش ہیں۔ "بنگو" میں کہیں میں نے شیمپین کی ایک بوتل جیتی۔ سب نے مجھے کوسا کہ کس بد ذوق کو یہ نعمت ملی ہے۔ مَیں بھی ڈھیٹ تھی۔ بوتل کھولنے نہ دی۔ لندن آ کر میں نے فخریہ اپنے میاں کو یہ انعام دکھایا۔ اس پر اس وقت بھی "مسز آرمنڈ" لکھا ہوا ہے۔

دُوسرے دن صبح ناشتے پر آدھے چہرے غائب۔ مُفت کی زیادہ پی گئے تھے۔ اپنے اپنے کیبن میں اوندھے پڑے تھے۔ سمندر بھی ذرا زیادہ پی گیا تھا۔ بدمست ہو کر اَناپ شناپ بکنے لگا اور دوپہر تک تو بالکل ہاتھوں سے نکل گیا۔ جہاز میں ایک مسلسل زلزلہ برپا ہو گیا۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے نہ رہی۔ میں شرابیوں کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر قدم ڈالتی بمشکل لنچ روم تک پہنچی تو کل پانچ چھ جواں ہمت نظر آئے جن کے سنگ دانے کافی مضبوط تھے۔ مَیں نے عرقِ انناس اور سلاد پر اکتفا کیا۔

شام کو جہاز نیپلز کے قریب آہستہ ہونا شروع ہوا۔ آفتاب کا وقتِ زوال ایک حسین عبرت! اس کے زعفرانی زینے آسمان سے لے کر کشتی تک معلّق تھے۔ لٹتے لٹتے وہ ہم انسانوں سے جمہوری ربط قائم کرنا چاہتا تھا۔ جب کل پھر عروج پر آئے گا، تو آنکھیں سَر پر ہوں گی اور پھر وہی فرعونِ بے سامان۔ پانی کے تاریک غاروں کے مُنہ کھلتے چلے گئے اور اُن میں سورج کے خوفزدہ زرد رُو رضا کار ہڑپ ہو گئے۔ لہریں شارکوں کی طرح جبڑے پھاڑے شام کی طرف لپکیں اور اس کی بھاگتی ہوئی دُم کو بھنبھوڑ ڈالا۔ ایک ناگزیر سیاہ ابدیت طاری ہو گئی۔ کہیں کہیں ایک ننّھی سی موج سفید سیپوں کی طرح چیرتی ہوئی نظر آجاتی۔

ان پانیوں میں خداؤں کی طاقتیں ہیں۔ کتنے سُورجوں نے راج رچے۔ کتنے چاندوں نے چاندنیاں منائیں۔ کتنے معاشرے اُبھرے اور گہنائے لیکن اس کی لازمان اور لامکان روانیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ موت پر حاوی۔ زیست پر غالب۔ یہ حیاتِ مُسر کی اندرونی خواہشات! یہ خدائے معبود، خالقِ کائنات کی ابدیت کا ایک مادّی مظاہرہ!

قریب نیپلز کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔

قاہرہ

ہمارا جہاز نہر سویز میں آہستہ آہستہ ایک عجب بے اعتنائی کے ساتھ داخل ہوا۔ ہم سب باہر ڈیک پر نکل آئے اور مختلف خیالات میں ڈوب گئے، سب زیادہ تر خاموش تھے اور اپنی اپنی یادوں سے ہم کلام۔ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔" کوئی سویز کی تاریخ میں گم تھا۔ کوئی قاہرہ کی شبانہ رنگینیوں کے پروگرام میں، کوئی فہرست خرید و فروخت میں، تو کوئی اُبھرتے ہوئے چاند کے رُومان میں۔ میں اکیلی کھڑی موجوں کی تنظیم کو دیکھ رہی تھی۔ کس ضبط کس فراخدلی سے ہماری "اطالوی حویلی" کو راستہ دیتی جا رہی تھیں۔ سویز کبھی بھی سیاسی طاقت یا گروہ کے قبضے میں ہو، اقوامِ متحدہ کی اسمبلی میں اس پر کتنے ہی طویل مباحثے ہوں، دُنیا کا امن چاہے اسی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے، لیکن اس کے پانی غیر جانبدار ہیں۔ ہر مہمان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہر ایک سے یکساں سلوک روا رکھتے ہیں۔ کتنی للچائی نظریں اس پر ماضی نے ڈالیں، یہ ہمیں معلوم! کیسی کیسی ناگہانی آفتیں اس پر آنے والی ہیں۔ یہ خدا کو معلوم! لیکن یہ نیلگوں شاہراہ! یہ مغرب و مشرق کی معاشی

شاہ رگ اپنی فطری معصومیت میں رواں ہے۔ تاریخی جرائم سے بے خبر موجودہ دھمکیوں سے نابلد، اِس امن و سکون سے جو ازل سے تھا اور ابد سے جُدا نہیں، بہتی جارہی ہے۔

شام ایک ریشم زبان سیاستدان کی طرح آہستہ آہستہ روشنی کی جڑیں کاٹتی ہوئی آرام سے کائنات پر غالب آگئی۔ شفق کے کچّے رنگ پانی میں گھُل کر پھیل گئے۔ لہروں کی پھُوار میں آبی فاختاؤں کے غوطے! ہر طرف سفید سفید جھاگ! معلوم ہوتا تھا زیرِ آب ہزاروں گوالنیں دُودھ بلو بلو کر اُچھال رہی ہیں۔ پورٹ سعید قریب تر ہونے لگی۔ ننھّی ننھّی روشنیوں کی قطاریں دُور ساحل پر! جیسے جل پریوں کی سرحدِ آب پر درخشاں حباب آویزاں ہوں۔

جہاز نے لنگر ڈال دیے۔ رات بے تابی سے کٹی۔ کل صبح قاہرہ کی سیر! جہاز والوں نے بارہ گھنٹے کا پُورا پُورا استعمال بتا کر، رُوپے وصول کر لیے تھے۔ صبح کاذب سے اُٹھ کر تیار ہوئے۔ میلی میلی کشتیوں میں بیٹھ کر گدلے گدلے پانی پر گزرتے ہوئے مصری سرزمین پر قدم رکھّا۔ جہاز کی حدود بندی کے بعد زمین کی فراخی بہت بھائی۔ کسٹم افسر نے پاسپورٹ دیکھا، پھر مجھے دیکھا: "لندن جا رہی ہیں؟" "جی؟" "کیا کریں گی۔ یہیں رہ جائیے۔" مَیں نے پہلی دفعہ غور سے کسٹم افسر کی شکل دیکھی۔ مصری گول چکنی موچھل شکل۔ تو یہ ہیں مصر کے "شیر دل جوان!" مَیں نے دل میں سوچا اور ہنسی، پھر ذرا سی ڈری۔ اگر سرکاری شروعات یہ ہیں تو آگے شہر میں کیا حشر ہوگا۔ دو ڈچ عُمر رسیدہ میموں نے مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے بہت پیار سے دیکھا۔ ایک کا خاوند اور اکلوتا بچّہ اس کی نظر کے سامنے جرمنوں نے گولی سے مار دیا تھا۔ وہ جب سے دُنیا کی سیروں میں سرگرداں تھی۔ پیسا بے شمار دُکھ اَن گنت۔ ایک کے ذریعے دُوسرے کو بھُلانا چاہ رہی تھی۔ پیسا

شاید سکھ خرید نہیں سکتا لیکن بہت سے دُکھ بکوا سکتا ہے یا علیش کے پاس رہن رکھوا سکتا ہے۔ یہ بُوڑھیاں خاصی دلچسپ تھیں لیکن اسّی کے پار جا چکی تھیں۔ ایک تو میرے ساتھ قدم ملا کر چل نہیں سکتی تھیں اور میں قدم چھوٹے کر نہیں سکتی۔ اگر کوئی مجھے آہستہ چلنے کو کہے تو میرا دَم گھُٹ کر گھٹنوں میں آ جاتا ہے۔ دُوسرے وہ بزرگ اِس حُلیے پر پہنچ چکی تھیں کہ ان کو دیکھ کر قاہرہ کے آثارِ قدیمہ کو دیکھنے کا شوق ذرا دھیما پڑ جاتا تھا۔ خستہ کمر اور شکستہ دندان اہرامِ مصر کے سامنے تو شاید زیادہ غیر آہنگ نہ لگیں لیکن صبح ناشتہ پر تازہ گلابی مکھن اور کرارے ٹوسٹ کے سامنے بھُوک پر ذرا سی اوس ڈال دیتے تھے۔ میں نے اپنے پر ہزار لعنت بھیجی۔ لاکھ غیرت دلائی آخر ہم پر بھی یہ وقت آئے گا۔ اگر خدا نہ کرے اتنا جی گئے۔

لاطن امریکی میٹر یوسفِ بے کارواں ہو کر بھٹک رہے تھے اور کئی دفعہ گفتگو کے لیے بہانے ڈھونڈ کر آ چکے تھے۔ ہم نے دن بھر کے لیے اُن کو اپنا محافظ بنا لیا۔ اگر مجھے ذرا بھی کھٹکا ہوتا کہ ان کی محافظت بین الاقوامی خصومت وصعوبت بن کر میرا ذہنی امن پراگندہ کر دے گی تو میں ان کو بھی پرے پرے رکھتی۔ موسیو الوار یز تھے تو بہت شریف اور نیک نیت لیکن میرے لیے ہر ایک سے بلا وجہ لڑنے اور مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ دو جگہ ان کو عربوں کی ضربوں سے بچایا۔ دو تین بار خود اپنے جہازی ہمراہیوں سے بھڑ گئے۔

پورٹ سعید سے قاہرہ کافی دُور ہے۔ ہماری بس اڑھائی گھنٹے میں قاہرہ پہنچی، قاہرہ کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ہماری ٹورسٹ بس نے ایک بڑے ہوٹل میں اتار دیا۔ ہاتھ مُنہ دھو کر ہم اپنے مقرّرہ تاریخی مقامات دیکھنے روانہ ہوئے۔ قاہرہ قدیم وجدید تہذیب کی ایک کھچڑی ہے۔ اُس کی عمر چار ہزار سال قبل از مسیح بتائی

جاتی ہے اور بعض مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی ۱۹۶۰ء میں ڈائی کے ہاتھوں میں گرم گرم نرم نرم وارد ہوا ہے۔ جدید ترین ہوٹل، عیش کدے۔ تھیٹر، ناچ گھر۔ اسے مشرقِ وسطیٰ کا موڈرن پیرس بھی کہتے ہیں اور قدامت کا گہوارہ بھی۔ وہ نقشہ جو عموماً اسلامی ممالک میں ہے یہاں پر بھی ہے۔ ایک طرف بدّو اور اُونٹ۔ دُوسری طرف کیڈلک اور بیوک۔ ادھر پھٹے حال ننگے پیر بچے، اُدھر موٹی چکنی امیر عورتیں پنسل اَبرو۔ پنسل، ہیلون کے ساتھ اپنی شاپنگ میں مصروف[۱] ہماری بس دریائے نیل پر جا کر رُکی۔ دریائے نیل تاریخ کی سیرگاہ۔ مصر کی رگِ زراعت۔ اس نے سیزر کی آبدار فوجیں، قلوپطرہ کے جشنِ محبت دیکھے ہیں۔ توتنخ آمون کے غضب وستم اور بنی اسرائیل کے الم وغم، یوسف کا حُسن، زلیخا کے ناز دیکھے ہیں۔ یہ نپولین کی آماجگاہِ مشرق اور مارک انتھونی کی کربلائے عشق! یہ مورخوں کا تخیّل اور شاعروں کا خواب! کیا یہ دریائے نیل ہے؟ ایک چھوٹی سی گدلی نہر جس کے ایک طرف مخملیں محفلیں اور نقرئی قہقہے، دُوسری طرف سنسان غربت۔ یہ حقیر نالہ تاریخی نیل کا مضحکہ لگ رہا تھا[۲]۔ اس کے سارے ڈرامۂ ماضی پر ایک تمثیلچہ! شاید کتابوں میں چیزیں بڑی اور شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ مورّخ کا زورِ قلم ان کا رقبہ دوگنا کر دیتا ہے، لیکن ہم نے تو سُنا تھا کہ دُور سے چیز چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں قریب آ کر اور چھوٹی معلوم ہوئی۔ یہ دریا جس کے ایک کنارے پر مغربی موسیقی کے لپٹے اُٹھ رہے تھے اور مغربی لباس، مغربی آداب میں نے آنکھیں دوبارہ ملیں۔ کیا یہی دریائے نیل ہے۔ کہیں صدیوں کا مغالطہ تو نہیں ہو گیا!

---

۱ لیکن اب ایک عرصے سے یہ تفرقہ مٹتا جا رہا ہے۔ خدا ناصر کی عمر میں برکت دے۔

۲ یہ فروری کا مہینا تھا اور نیل کا پانی بالکل اُتر چکا تھا۔

SPHINX کے قریب گئے۔ سر عورت کا، چہرہ مرد کا، جسم شیر کا۔ یہ رازوں کا صیغہ! ایک شاہی معمّہ! ایک انگریزی استعارہ! خیال تھا کہ میں اس کے آگے بونا معلوم ہوں گی، لیکن میں نے اس کے سامنے گردن تان کے تصویر کھینچوائی۔ نہ میں اتنی چھوٹی تھی، اور نہ وہ اتنی بڑی۔ ایک وقت میں ہم دونوں کیمرے کے لینز میں سما گئے۔

آگے چلے تو اہرامِ مصر۔ باہر سے اینٹوں کے سنگین تکون۔ اندر سے مہیب فرعونی مقبرے۔ ہولناک حیرت انگیز! تین ہزار سال قبل از مسیح! کن شاہی معماروں نے تراشے ہوں گے، کتنے سالوں میں کتنے مزدوروں کی قربانی سے تیّار ہوئے، ان کی مٹّی انسان کے خون سے گندھی۔ ان کی اینٹوں میں انسان کی ہڈیاں پسیں! لاکھوں غلاموں کے آنسو اور آہ وبکا سے فرعونیت نے ارضِ ابدیت خریدی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسان کی نخوت و وحشت کہاں جا کر رُکے گی! اہرامِ مصر اندر سے زیادہ وسیع اور بارعب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے چالیس منٹ میں چار ہزار صدیاں طے کر لیں۔ جادو تھا کہ طلسم ہوشربا کے افسانے چھومنتر اور اونٹ گاڑیوں سے کود کر جدید کاروں میں بیٹھ گئے۔ صحراؤں کی ازلی خاموشی اور بیسویں صدی کے ہارن موٹر مختلف زمان و مکان کا تصادم۔

موٹر کچھ میل چلی تو ایک اشارہ ہوا کہ روکو۔ ایک میم کے گُردے کمزور تھے۔ اُتر کر غسلخانہ جانا چاہتی تھی۔ اس کے شوہر نے مضحکہ آمیز لہجہ میں اس سے کہا: "تم ان کے مقدّس ٹکتے کو پلید مت کرو۔" مصری ڈرائیور پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ "نہ میں مصر کی تحقیر سنوں گا، نہ ناصر کی، نہ اسلام کی۔" انگریز کو معافی مانگنی پڑی۔ مجھے انگریز کی ذہنیت پر ذرا غصّہ نہ آیا۔ البتّہ افسوس ہوا کہ یہ لوگ اتنی تعلیم کے باوجود فراخ دل نہ

ہو سکے۔ اسلام کا نام آتے ہی اُن کا ذہنی اُفق سُکڑ جاتا ہے اور پُرانے تعصّبات عود کر آتے ہیں۔ وقت کی بات ہے۔ عمر کے ساتھ پختگی آتی ہے۔ شاید چند سال پہلے اس قسم کے فقرے پہ مجھے طیش آتا، لیکن اب مجھے یُوں محسوس ہوا وہ میرے مذہب کی بے عزّتی نہیں کر رہا بلکہ خود اپنی تہذیب اور ایمان کی تحقیر کر رہا ہے۔ مجھے کچھ احساسِ برتری ہو چلا کہ شاید میرا خدا اور میرا مذہب زیادہ فراخ حوصلہ ہیں۔ میرے خدا کی رواداری کے کیا کہنے جس نے خود فرعون کی رسّی دراز کی کہ وہ خدا بن کے اپنی پرستش کروائے۔ میرے مولا نے مصری دیوتاؤں کو چُونے اور مٹّی میں لافانی ہونے کی اجازت دے دی۔ روم کے دیوتا سنگِ مرمر میں، ہندی دیوتا پیتل سونے میں آج بھی کھڑے ہیں۔ آج بھی انسان انسان کو پُوج رہا ہے۔ جب یہ سب میرے رب کو روا ہے تو ہم کون بُرا ماننے والے؟

میرے نگہبان دوست موسیو الواریز سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ بازاروں میں میرے لیے راستہ بناتے ہوئے عربوں کے لبادوں اور لبیکوں سے بچاتے ہوئے مجھے ایک تحفوں کی دوکان پر لے گئے۔ مَیں مختلف کونوں کو ٹٹولتی دو چیزیں اُٹھا لائی، ملکہ نفرٹیٹی اور حشیش کا حقّہ اور دونوں میز پر دھر دیے۔ "یہ حشیش پائپ کتنے کا ہے؟" میں نے پُوچھا۔ عربی نوجوان دُوسری طرف سے بولا: "ہر دفعہ جب آپ حشیش کہتی ہیں، میرا دل ہلا دیتی ہیں۔" مَیں نے سر ہلا دیا اور موسیو الواریز لپک کر میری مدد کو پہنچ گئے۔ مَیں تو کھسک گئی وہ دام چکاتے رہے اور آدھی قیمت پر ملکہ نفرٹیٹی اور حقّہ حشیش میرے تھیلے میں ڈال دیے۔

ہم نے ہوٹل میں آن کر کھانا کھایا۔ پھر اپنی پُرانی بس میں بیٹھ کر واپسی کا رُخ کیا۔ ایک امریکی معہ بیوی اور سات بچّوں کے سارا دن کی خرید و فروخت سے لدا پھندا آن

کر بیٹھ گیا۔ ہر بچّے کے سَر پر فاروقی ٹوپی تھی۔ اس نے شاید مصری تاریخ تو کتابوں میں پڑھی ہو گی اور نہ بھی پڑھی تو پھر کبھی پڑھ لے گا لیکن مصری بازاروں کے سستے سودے کہاں ملتے! دُوسرا جوان جرمن جوڑا آتے ہی سیٹ پر نڈھال ہو کر ایک دُوسرے کے کندھے پر سَر رکھ کر سو گیا۔ دونوں طالب علم تھے اور دن بھر قاہرہ کی اینٹ اینٹ کا مطالعہ کرتے کرتے خود گارا بن گئے تھے۔ تاریخ دماغ میں بھنبھنا رہی تھی۔ نیند جلد چھا گئی۔

خنکی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ بس ابھی گرم ہی ہوئی تھی کہ کوئی ۲۰ میل پر روک دی گئی۔ فوجی قافلوں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ واپس قاہرہ جاؤ۔ اسرائیل نے کئی جگہ چھاپے مارے ہیں اور پورٹ سعید کے راستے بند کر دیے ہیں۔" بس میں ایکدم کھلبلی مچ گئی۔ ہمارا جہاز لنگر ڈالے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ دو بجے رات کو اُسے لنگر اُٹھانا تھا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ رات قاہرہ گزار کر ہوائی جہاز سے دُوسرے دن جنیوا چلے جائیں۔ ایک شور، ایک خلفشار! آخر قاہرہ واپس آئے۔ انگریزی سفیر نے مرکزی وزارتِ خارجہ سے اجازت دلوائی۔ بس روانہ ہوئی۔ پچاس میل بعد پھر مصری فوجوں نے روک دیا۔ "واپس جاؤ۔ ہم کوئی پرمٹ وغیرہ نہیں مانتے۔" ہمارے ساتھیوں کا اعصابی ڈھیر ہو گیا۔ گالیوں پر اُتر آئے۔ وہ انگریزی میں گالیاں دے رہے تھے۔ اور فوجی دستے عربی زبان میں ہم کو بے نُقط سُنا رہے تھے۔ ان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ کچھ مصری سپاہیوں نے تالیاں بجا بجا کر انگوٹھے دکھانے شروع کیے۔ ہماری بس کے بھُورے بھُورے بھبھوکا چہرے اور چڑ گئے۔ وقت کم تھا اور ہمارا جہاز انتظار کر رہا تھا۔

"کہاں ہے تمہارا کپتان بُلاؤ اُسے۔"

مَیں اس ساری کیفیت کے مزے لے رہی تھی۔ صدیوں سے سفید چمڑی عربی

اعصاب کے ساتھ کھیلتی رہی ہے اور آج بھی کھیل رہی ہے۔ دومنٹ کے لیے ان یوربینوں کے تنتنے ہوئے اعصاب اور بگڑے ہوئے مزاج دیکھ کر مجھے لطف آیا۔ موسیوالواریز نے حیران ہو کر مجھے دیکھا "آپ مسکرا رہی ہیں؟ کیا مشرقی عورت کا ضمیر اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے؟" خالص ستانے کی نیت سے میں خاموش مسکراتی رہی۔ موسیو زیچ آ کر اوروں سے ہمکلام ہو گئے۔

بہت سی کج بحثی کے بعد آخر کار بس روانہ ہوئی۔ رات کے خنک خلد میں چاند اکیلا تن تنہا لٹک رہا تھا۔ گویا ساری مخلوقات کے گناہ کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔ صرف دو تارے اُس وقت اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ باقی سب روپوش ہو چکے تھے۔ کچھ دُم دار گھبراہٹ میں اپنی دُمیں پیچھے چھوڑتے گئے۔ جوں جوں بس میل طے کرتی، مسافروں کے رُکے ہُوئے سانس رواں ہُوئے۔ اُمید بندھی کہ آخر ہم وقت پر پہنچ ہی جائیں گے۔ ایک دو گنگنانے لگے۔ ایک نے ہلکی ہلکی سیٹی میں اپنا دبا ہوا احساسِ خطر ظاہر کیا۔ حُسن پرستی نہ قحط سالی میں ہوتی ہے اور نہ خوف کی حالت میں۔ ذرا اطمینان ہوتے ہی موسیوالواریز کو بھی چاند یاد آیا۔ اس کی طرف اس فخر سے نظر ڈالی، گویا چاند اُن کی اپنی تازہ تازہ دریافت ہے۔ "دیکھیے ذرا دیکھیے، کتنا حسین کتنا جوان ہے چاند!" میں نے گردن موڑے بغیر کہا:

"یہ تو بالکل فاقہ مست ننگ ملنگ سادھو لگ رہا ہے۔ جو چالیس چلّے کاٹ کر اپنے حجرے سے باہر نکلا ہو۔ اس کا تو آدھا انجر پنجر رہ گیا۔ پسلیاں گِن سکتے ہیں۔" لاطن امریکی خون غُرّایا۔ "آپ نے بھی نرالا مذاق پایا ہے! آپ کو چاند میں بھی رُومان محسوس نہیں ہوتا۔" میں بولی چاند کا رُومان تو رُوس نے پنکچر کر دیا۔ جب سے ان کا لال جھنڈا وہاں

لہرایا ہے۔ عاشقوں نے اور ستارے تلاش کرنے شروع کر دیے۔ شاعروں نے استعارے بدل دیے۔ زبان نے دُوسرے محاورے گھڑ لیے۔ اب چاند تو رُوس کی سولھویں ریپبلک ہے اور ایک سرد اور سنسان سائبیریا۔"

موسیو ربو بولے! "خدا بچائے مجھے مشرق سے اور اس کی عورت سے، نہ کبھی اسے سمجھا اور نہ اُسے سمجھ سکوں گا۔"

"زندگی سمجھنے کا وقت کہاں دیتی ہے۔ وہ دیکھو منزل کے آخری پاؤں!"

"ہمارا جہاز ساحل سے دُور سرمئی دُھند میں کھڑا صورِ اسرافیل پھُونک رہا تھا۔"

لندن اور نیویارک

ایک ادھیڑ عمر کا شیر ببر پُرانے شکاروں کی یادیں پیٹ میں ڈکارے زمین پر تخت نشین ہے۔ دُوسرا جواں بخت عقاب آسمان میں منڈلا رہا ہے۔ ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے۔ دُوسری طرف نصف النہار پر چمک رہا ہے۔

دو جُداگانہ شخصیّتیں ہیں۔ رنگت جُدا، ساخت جُدا، چال جُدا، سال جُدا، غذا جُدا، تعلیم جُدا، اقدار جُدا، معبود جُدا۔ ایک دارالحکومت ہے اور ایک دارالتجارت۔

دونوں کے گوداموں میں انسانی مال کھچا کھچ بھرا ہے، لیکن گودام گودام انسان انسان میں فرق ہے۔ نیویارک کی عمارت، سائنس انجینیرنگ کا کرشمہ، یہ دیو قامت ہیبت کدے غیر جذباتی اور غیر انسانی۔ یہ شیشے اور فولاد کے فرعون جو فلک تک خدائی کا دعویٰ کرتے پہنچ گئے۔ یہ ماچس کے ڈبوں کے فلک بوس طومار جن میں انسانیت دَم بُخت ہے۔ اِن جدید پنجروں کے کاروباریوں نے اپنی کھڑکیوں سے کبھی بہار کے شگوفوں کو چٹکتے نہ سُنا نہ کبھی خزاں میں دربدر پتّوں کی ویرانہ وحشتیں دیکھیں۔ یہ بے حس بلندیاں، یہ طویل سرد مہریاں یہ شیطانی لاف زنیاں، جنہوں نے انسان کو چیونٹی سے زیادہ حقیر بنا دیا۔ ان کے نوک دار

نمائشی کھڑکیوں میں مصنوعی شگوفے ہوتے ہیں، لیکن فضا میں برف اور ہوائیں تیز ہوتے ہیں۔ نیویارک کی گالیاں نیگرو اور نیگرو کی سات پُشت کو دیتے ہیں۔ لندنی "یاد تھیں جو گالیاں وہ صرفِ باراں ہوگئیں"۔ اس مُہذّب شہری کی زبان پر مُغلّظات صرف موسم کے لیے مخصوص ہیں۔

اگر اتفاق سے آپ کو کوئی انگریز مُسکراتا ہوا مل جائے، تو آسمان پر نظر ڈالے بغیر سمجھ لیجیے کہ لندن پر سورج چمک رہا ہے۔ اگر کوئی امریکی مُسکراتا ہُوا مل جائے، تو اخبار دیکھے بغیر سمجھ لیجیے کہ "کاسترو" پٹ رہا ہے۔ گو انگریزوں نے تاریخ انگلستان میں ۱۶۸۸ء کی بغاوت کے لیے لفظ "عظیم الشان" استعمال کیا تھا اور پھر دوبارہ اگر یہ لفظ استعمال کیا، تو ۱۹۵۹ء کے موسم کے لیے کیونکہ سُورج کو بچّہ سقہ کی طرح پُورے اڑھائی دن کی بادشاہت ملی تھی۔ اگر آپ کو ملکہ معظّمہ الزبتھ خوش قسمتی سے شام کی پارٹی پر مدعو کریں، تو کارڈ پر لارڈ چیمبرلین لکھ دے گا کہ فلاں فلاں دن بکنگھم پیلیس میں جشن منعقد ہوگا۔ "بشرطیکہ بارش نہ ہوئی"۔

لندن میں راہ چلتے وہی پرانی وضع کے، وہی بولر ہیٹ وہی تنگ کوٹ نظر آتے ہیں، دُوسری جگہ بُش شرٹ پر انگوری جامنی اناناس اور "ہولا ہُولا" گھانس کی گھگھریاں۔

ایک قوم ناک سے بولتی ہے۔ دوسری دانتوں سے۔ پلّے دونوں نہیں پڑتیں۔ جب امریکی کا مُنہ ہل رہا ہو تو سمجھیے وہ چیونگم چبا رہا ہے۔ جب انگریز کا مُنہ ہلے تو سمجھیے کہ الفاظ چبا رہا ہے۔ نیویارک کی زبان لاطینی رسم الخط میں امریکی زبان ہے اس کا انگریزی سے کوئی تعلق نہیں، سوائے رسم الخط کے یا رسمی خبط کے۔

لندن میں "شکریہ" "مہربانی" سُنتے سُنتے کان سُن ہو جاتے ہیں۔ بس کنڈکٹر، قلی، سیلز گرل "تھینک یو" کی خود کار مشینیں ہیں، لیکن تمیز و آدمیت نیویارک میں آکر ہانپ جاتی

شہتیر آسمان کے گداز گوشت میں چبھ رہے ہوں گے۔ اُوپر سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے زمین تنگ ہو گئی ان پر۔ نیچے سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے آسمان تنگ ہو گیا۔

نیویارک سے لندن آ کر معلوم ہوتا ہے پاؤں زمین پر لگ گئے۔ چیونٹی سے ہم پھر انسان بن گئے[۱]۔ لندن کی عمارات چُونا مٹی، بوسیدہ موسم زدہ، سال خوردہ۔ لیکن انسانی گرفت میں۔ گردن اُٹھا کر دیکھ سکتی ہے۔ نظر مُڑ کر جلد واپس آ سکتی ہے۔ اس کے باغوں کے سبزہ زاروں میں انسان کچھ لمحوں کے لیے کارخانوں کے دُود دُخانوں کو بھول کر اس کے انگوری ریشوں پر لوٹ لگاتا ہے۔ دل بے ساختہ چاہتا ہے کہ چوپایہ بن کے گھٹنوں کے بل اُس کی تازہ کچّی کچّی ہریاول کو چرنے لگے۔

لندن اور نیویارک دونوں پانی میں گھرے ہُوئے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ نیویارک میں پانی باہر ہی رہتا ہے۔ لندن میں ہر وقت اندر پڑتا رہتا ہے۔ "شیخ پیر" نے کہا تھا "کہ تیّاری سب کچھ ہے" تو ایک لندنی ہر وقت پا بہ رکاب رہتا ہے۔ ہاتھ میں چھتری، شانہ پر برساتی، پانچ اذانوں کی طرح ٹیلی ویژن پر پانچ دفعہ موسم کا حال بتاتے ہیں: "گھبرائیے نہیں۔ موسم اس حال میں سدا نہ رہے گا۔ جلد سے جلد خراب ہونے والا ہے۔" نیویارک میں بہار اپریل میں کیلنڈر کے مطابق آ تو جاتی ہے لیکن شہر کی سنگین فصیلوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ باہر ہی منڈلا منڈلا کر چلی جاتی ہے۔ لندن میں سرکاری اور کاروباری طور پر بہار اپریل میں آ تو جاتی ہے، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ اصل اپریلی بہار جون میں آتی ہے۔ اپریل میں لندن کے ہر اشتہار میں بہار کا ذکر ہوتا ہے۔ ہر دُکان کی

---

[۱] لندن کا مارواڑی بھی نیویارک کی تقلید کرتے ہوئے اُونچی عمارات بنانا چاہتا ہے لیکن لندن کاؤنٹی کونسل نے کسی حد تک اُس کے ہاتھ روک رکھے ہیں۔ ع۔

ہے۔ نیویارک کی ٹیکسی لال پیلی، کالی معلوم ہوتی ہے جیسے کارنیول کے مسخرے۔ یا کتھا کلی کے بہروپیے۔ لندن کی ٹیکسی سے دو یادیں وابستہ ہیں، مہاراجہ یا جنازہ۔ کچھ راجواڑے اس قسم کی کالی رولز رائیس میں چہل قدمی کے لیے نکلتے تھے یا کبھی کسی گورے کا تابوت اسی قسم کی کار میں اپنے آخری سفر پر نکلتا تھا۔ نیویارک کی ٹیکسی میں ڈرائیور اکثر جوان حبشی ہوتا ہے جو بیٹھا ریڈیو پر "راک بے بی رول بے بی" سنتا رہتا ہے۔ لندن کی ٹیکسی میں ستّر سالہ "مُعنک" ڈرائیور جاسوسی ناول یا گھڑ دوڑ کی پیشینگوئیاں پڑھ رہا ہوتا ہے۔

ایک جگہ سینڈوچ سینڈوچ ہوتا ہے۔ دُوسری جگہ سینڈوچ پُورا لنچ ہوتا ہے۔ یعنی دو ڈبل روٹیوں کے درمیان ایک برّا۔

لندن، شہری منصوبہ ساز کا ڈراؤنا خواب، نیویارک تشریح بدنی کا نقشہ

لندن میں پولیس ایک مایۂ ناز ادارہ ہے۔ "بوبی" ایک پیار کا لفظ ہے۔ نیویارک میں "کوپ" تھانیدار ہے۔

اگر غریب ہو تو بیمار لندن میں پڑو۔ امیر ہو تو تفریح نیویارک میں کرو۔

لندن کے تھیٹر میں ٹکٹ پانچ رُوپے کا اور ڈرامہ لاکھ روپے کا۔ نیویارک میں وہی نشست ۵۲ رُوپے کی، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

ایک جگہ ڈیڑھ پاؤ اخبار میں دُنیا بھر کی خبریں۔ دُوسری جگہ اڑھائی سیر اخبار کے ڈھیر میں سوا دو سیر اشتہارات چار چھٹانک خبریں۔۔ ایک شہر میں کلچر کی کاشت ہو رہی ہے، بلکہ۔۔ تجارتی درآمد برآمد ہو رہی ہے۔ دوسرا شہر خود کلچر ہے۔ لندن کی دیرینہ تاریخی عمارت پہ کاہی اُگ رہی ہے۔ نیویارک کے حرارت خانوں میں تاریخ اُگائی جا رہی ہے۔ آزادی لندن میں ایک اساسی حق ہے، ایک سیاسی عادت ہے۔ نیویارک میں ایک مجسمّہ ہے، ایک بُت ہے۔